رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظرنامہ

پروفیسر عبدالحق
سابق صدر
شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظر نامہ

پروفیسر عبد الحق

سابق صدر

شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

ناشر	:	صائمہ حق
اشاعت	:	اگست ۲۰۱۰ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	تین سو روپے
طابع	:	اصیلا پریس، دریا گنج، نئی دہلی
کمپوزنگ	:	محمد اسلام خان (9910100445)

Rashid Ahmad Siddiqi

ka Saqafati Manzarnama

Professor Abdul Haq

9350461394

2315 - Hudson Line
Kingsway Camp. Delhi - 110009

Price : Rs. 300/-

پیکرِ اخلاص و ایثار

ڈاکٹر شباب الدین

صدر شعبۂ اُردو

شبلی نیشنل پی۔جی۔کالج، اعظم گڑھ

کے نام

سراپا نورم از نظارۂ تو

ترتیب

حرفِ آغاز

صد سالہ جشنِ رشید کے موقع پر راقم نے دہلی یونیورسٹی میں ایک مذاکرے کا اہتمام کیا تھا جس میں بڑے محترم و مقتدر اساتذہ نے شرکت فرمائی۔ ان مقالات کو مرتب کر کے 'رشید احمد صدیقی افکار و اسالیب' شائع کیا گیا، جس کی توقع سے زیادہ پذیرائی ہوئی۔ اہلِ نظر نے ناچیز کے مضمون کی بڑی قدر کی۔ ان کی عزت افزائی نے مزید مطالعہ کے لیے مہمیز کیا۔ اس مضمون کو کچھ اضافے اور نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ ساتھ ہی رشید صاحب پر لکھے گئے دوسرے مضامین بھی شاملِ کتاب ہیں۔ غیر مطبوعہ خطوط کی بازیافت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے آبائی وطن منڈیاہوں بھی کئی بار جانا ہوا۔ چھوٹے بھائی جناب نیاز احمد کے نام لکھے گئے ۵۳ خطوط حاصل ہوئے۔ ان کے بھتیجے جناب شکیل احمد صدیقی کا شکرگزار ہوں کہ ان کے توسط سے یہ خطوط دستیاب ہوئے۔ یہ بالکل گھریلو اور نجی نوعیت کے مکاتیب ہیں۔ لیکن ان میں کہیں کہیں ذاتی زندگی اور ذہنی کیفیات کے پُر اسرار اشارے بھی ملتے ہیں جو بڑے جہاں آشوب ہیں۔ میں محترم سید ظفر حسین صاحب مقیم جامعہ نگر نئی دہلی کا ممنونِ احسان ہوں جنھوں نے اپنے عزیز سید آلِ حسن زیدی صاحب کے نام لکھے گئے ۳۵ خطوط عنایت کیے۔ موصوف علی گڑھ سے فارغ دہرہ دون میں سرکاری ملازمت میں برسرِ کار تھے۔ فالج کی وجہ سے ان کی گویائی مسلوب ہے، اللہ انھیں شفا دے۔ آمین۔ یہ خطوط بھی ذاتی قسم کے ہیں۔ ان میں پھولوں اور پودوں سے رشید صاحب کی والہانہ وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ مقامی پھولوں کے علاوہ مغربی پھولوں کے اقسام، قلم کاری، موسم، مٹی، نمو وغیرہ پر ان کی ماہرانہ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان مکاتیب میں بھی ان کا منفرد اسلوبِ نگارش کہیں کہیں بڑا لطف انگیز ہے۔ ''رشید احمد صدیقی افکار و اسالیب'' میں شائع شدہ (۶۹) خطوط کو قندِ مکرر کے طور پر ان غیر مطبوعہ

خطوط کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ تاکہ وہ یکجا ہو جائیں۔ اور تقریباً ۱۵۷ خطوط کے اضافے سے کتاب کی افادیت دوچند ہو جائے۔ ضمیمہ میں کئی دوستوں اور عزیزوں کے تاثرات وتبصرے شاملِ کتاب ہیں۔ ان کے ستائشی اور مشفقانہ کلمات کے لیے ناچیز سراپا سپاس گزار ہے۔ رشید صاحب کی ہر تحریر کا تحفظ، وابستگانِ علم وادب کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ وثروت ہے۔ یہ ہماری ثقافتی سرگرمیوں کا شہادت نامہ ہے جس میں نصف صدی کے خوں چکاں منظر اور مسرتیں ہماری جبینِ نیاز پر نقش ونگار بن کر آویزاں ہیں۔ یہ صرف انشا واسالیب یا طنز وتنقید ہی نہیں ہیں بلکہ مبعوث ملت کے ماضی وحال کے رواں دستاویز اور منفرد مفکر ادیب کی دانشورانہ تنزیل ہے۔ میں رفیقِ حیات اور بیٹیوں کی دعاؤں ودستگیری کو سرمایۂ جاں جانتا ہوں۔

عبدالحق

یکم جون ۲۰۰۹ء

۷

لطیف الزماں خاں

(مکتوب)

یک شنبہ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۹ء

سی ۱۴۹/، غالب نما، حالی روڈ

گل گشت، ملتان، ۶۰۷۰۰

ٹیلی فون نمبرز: ۵۲۱۴۵۵، ۵۲۲۴۲۴

گرامی قدر تسلیمات

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ شاید آپ کو یاد ہو ۱۹۹۲ء اوائل میں ڈاکٹر ظہیر صدیقی صاحب کے ہاں چند یوم کے لیے مقیم تھا۔ آپ سے بھی نیاز حاصل ہوا تھا۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ میرا پہلا اور آخری عشق غالب ہے لیکن عقیدت صرف رشید صاحب سے ہے۔ اب تک میں اُن کی بارہ کتابیں شائع کرا چکا ہوں۔ بارھویں میزانِ نثر جلد اول دو تین ماہ ہوئے شائع ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ جلد دوم دسمبر تک چھپ جائے گی۔

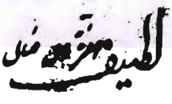
علی گڑھ میں میرے کرم فرماؤں کی کمی نہیں مگر میرے سابقہ وطن میں میرا صرف ایک بھائی، ایک دوست ہے آپ بھی جانتے ہیں مہر الٰہی ندیم صاحب۔ اُن ہی نے آپ کی کتاب رشید احمد صدیقی: افکار و اسالیب کا پہلے فوٹو اسٹیٹ اور پھر اصل کتاب بھیجی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ یہاں میرے ایک عزیز دوست نظیر صدیقی صاحب ہیں۔ رشید صاحب کے پرستار۔ میں نے آپ کی کتاب کا فوٹو اسٹیٹ انھیں بھیج دیا۔ مجھ سے انھوں نے دریافت کیا کہ کتاب کا سب سے اچھا مضمون کون سا ہے؟ میں نے لکھا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا مضمون ''رشید

احمد صدیقی کا ثقافتی سیاق" میرے نزدیک سب سے اچھا مضمون اس لیے ہے کہ آج تک اس پس منظر میں رشید صاحب کے بارے میں کوئی اور مضمون نہیں لکھا گیا۔

۲۳ ستمبر کو انھوں نے لکھا:

> "رشید احمد صدیقی اور اقبال دونوں کا خمیر تقریباً ایک ہی مٹی سے اٹھا تھا گو اُن کی شخصیت کی تشکیل میں اقبال کا فیضان اور اقدار کو بڑا دخل تھا۔ اس لحاظ سے بھی ڈاکٹر عبدالحق کا مضمون نہایت عمدہ مضمون ہے اسے کتاب کا سب سے اچھا مضمون کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون صاف گوئی اور حق گوئی کی بہت اچھی مثال ہے۔ عبدالحق کا مضمون فکری ہے اور محمد حسن کا مضمون واقعاتی۔ خود ڈاکٹر عبدالحق اقبال اور رشید احمد صدیقی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ اتنا عالمانہ اور مفکرانہ مضمون برسوں بعد نظر آیا ہے۔"

نظیر صدیقی وسیع المطالعہ ادیب ہیں ان کی شاید ہی کوئی تحریر ہو جس پر انھوں نے میری رائے نہ طلب کی ہو اور میں نے بھی انھیں وہی لکھا جو میرے ضمیر کی آواز تھی۔ جب انھوں نے مجھ سے دریافت کیا "رشید احمد صدیقی - افکار و اسالیب" میں سب سے اچھا مضمون کون سا ہے؟ عرض کیا "رشید احمد صدیقی کا ثقافتی سیاق" میں نے انھیں اپنی پسندیدگی پر اسباب بھی گنوائے۔ رشید صاحب کی تحریر "پرسوز" تھی جس نے آپ سے ایسا بے مثل مضمون لکھوایا۔



○

رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظر نامہ

عصرِ حاضر میں تہذیب سے جنونِ عشق کی حد تک وارفتگی کا نام رشید احمد صدیقی ہے۔ان کی پرتوِ فکر وتحریر کا ہر پہلو اسی جذبے سے معمور و منور ہے۔ اردو سے عقیدت رکھنے والا یہ مجذوب صفت پیکر، تخلیقی تاریخ میں منفرد اور غیر متبادل ہے۔ درد و درماندگی سے دوچار اردو ثقافت کی پُرسوز مسیحائی میں بھی کوئی ان کا حریفِ قلم نہ بن سکا۔ وہ بے مثل طنز و مزاح کے مالک و مصدر، لافانی اسلوبِ نگارش کے ممتاز صاحبِ طرز ادیب اور نئی ادبی تنقید کے مبشر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی تمام تحریروں میں ثقافتی سوز و ساز کی روح موجِ رواں بن کر جاری ہے۔قصہ جدید وقدیم سے بے نیازِ اسلوب وانشا کے ابدی اقدار پر ایسی عبقری نظر کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کی گزرگاہِ خیال سے ہماری راتیں روشن اور دن کے اجالے نور فشاں ہوتے ہیں۔

دنیا کی بیشتر قدیم تہذیبیں دریاؤں کے دامن میں اقدار کی سربلندی سے سیراب ہوئیں۔ زمانۂ حال میں بھی بڑے بڑے صنعتی اور سوادِ اعظم کے ترجمان شہر بھی رودِ روانِ آب کے آغوش میں ہی آباد ہیں۔ ہندی ثقافت اور معیشت آج بھی ان کی محتاج ہے۔کشمیر میں نہر کے کنارے رہنے والے خاندان نے ترکِ وطن کر کے دریائے گنگا و جمن کے سنگم پر اپنی بستی بسائی۔ اسے کرشمۂ قدرت کہیے یا ترکِ وطن کی برکت کہ اس نہرو خاندان سے تین وزیراعظم اسی شہر سے نسبت رکھتے ہیں۔ الہ آباد کی سرحدوں سے متصل مرزا پور ہے جو گنگا کے کنارے آباد ہے یہاں سے لال بہادر شاستری اور پرتاب سنگھ نے وزارتِ عظمیٰ کی کمان سنبھالی۔ یہی ندی ضلع بلیا سے بھی

گزرتی ہے۔ ملک کے چھٹے وزیر اعظم چندر شیکھر کا مرزبوم یہی شہر ہے۔ یہی رشید صاحب کی پیدائش کی سرزمین بھی ہے۔ یہیں سکندر پور ہے جہاں ہر سو گلابوں کی کاشت ہوتی ہے۔ خوشبوؤں سے بھیگی فضا میں ہی رشید صاحب کے ہر تارِ نفس کی نشو و نمائے آرزو کا راز موجود ہے۔

ہم ہندی اساطیر میں گنگا کے مقام واحترام سے واقف ہیں۔ لیکن اردو ادب میں بھی اس کی کچھ کم اہمیت نہیں ہے۔ اقبال نے لافانی شعر کہہ کر ہمیں ایک پُراسرار حقیقت تک رسائی کے لیے آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔

اے آب رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو

عرب وعجم کے قافلے سب سے پہلے آبِ روانِ پنجاب کے کنارے خیمہ زن ہوئے۔ یا اس کے بعد جمنا کے کنارے لشکر انداز ہوئے۔ ان تمام ندیوں کو نظر انداز کر کے گنگا کا ذکر سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کسی معمہ سے کم نہیں ہے۔ ان سے قطعِ نظر اردو کا بڑا شاعر غالب کشتی سے اس دریا کو عبور کرتا رہا۔ دوسرا بڑا شاعر بھی اس ندی کو ریل کے ذریعے پار کرتا رہا۔ غالب شہر کے ساتھ باشندگانِ الٰہ آباد کو کوستے ہوئے شہرِ ستم گر سے بنارس پہنچے۔ اقبال نے اہالیانِ الہ آباد کو عقیدت کے ساتھ دعا دی اور شہر کو ایک یادگار بنا دیا۔

مرزا پور میں غالبؔ کے شاگرد عبدالرزاق شاکر پچھلی شہری استاد کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے۔ اسی دیار کے ایک عقیدت مند رشید احمد صدیقی اقبال سے نیاز حاصل کرنے لاہور حاضر ہوئے۔ غالب کی وفات کے سو سال بعد اس نواح کے نورِ نظر رشید احمد صدیقی نے غالب کی شخصیت اور شاعری پر ایک لافانی دستاویز لکھ کر ارادت مندی کا اظہار کیا جو غالبیات کی لوحِ تقدیر کی پرشکوہ تحریر بن گئی۔

گنگا کے دوسرے کنارے کچھ ہی فاصلے پر منڈیاہوں قصبہ ہے۔ یہ جون پور کی جنوبی تحصیل بھی ہے۔ جو شہرِ جون پور سے تقریباً بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر شاہ راہِ مرزا پور پر واقع ہے۔ یہ ایک عام گزرگاہ ہے۔ اسی شاہ راہ پر قالین بافی میں عالمی شہرت رکھنے والا شہر بھدوہی بھی بسا ہوا ہے۔ مرزا پور کے پاس بندھیا چل کی پہاڑیوں پر ہندوؤں کا ایک مقدس مندر ہے۔ ارادت مندوں کا قافلہ در قافلہ اس شاہ راہ پر ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ جون پور سے گزرنے والی تینوں

شاہ راہیں تیرتھوں کی جانب رہبری کرتی ہیں۔ مشرق میں کاشی، مغرب میں پریاگ اور جنوب میں بندھیا چل اور اگر شمال کو شامل کریں تو تھوڑے فاصلے پر گوتم بدھ کے کشی نگر، اجودھیا، بابا گورکھ ناتھ اور کبیر داس کے مزار کے علاوہ سید سالار مسعود غازی کے مزار کی زیارت کا عام راستہ یہی شاہ راہ ہے۔

رشید احمد صدیقی کے جدِ امجد پیر زکریا طویل مسافت طے کر کے اسی منڈیاہوں قصبے میں فروکش ہوئے۔ انھوں نے ایک مرکزِ رشد و ہدایت کی بنیاد رکھی۔ وہ محلّہ پیر زکریا کے نام سے ہی مشہور ہے۔ رشید صاحب کا آبائی مکان وہیں موجود ہے۔ رشید صاحب اپنے خطوط میں پتہ محلّہ پیر زکریا ہی لکھا کرتے تھے۔ ان کے بھتیجے شکیل احمد صدیقی پرنسپل منڈیاہوں انٹر کالج اب بھی وہیں رہتے ہیں۔

پیر زکریا دین کی اشاعت اور سرفرازی کے لیے سترہویں صدی میں ترکستان کو ترک کر کے واردِ پنجاب ہوئے۔ دہلی آئے مگر جی نہ لگا۔ الہ آباد آئے اور تقریباً ساٹھ میل کی مزید مسافت طے کر کے منڈیاہوں کو آخری آرام گاہ قرار دیا۔ جو آج بھی ہر خاص و عام کو نور و سرور کی ارزانی سے سرشار کرتا ہے۔ رشید صاحب نے بارہا نسبتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو نام و نسب کے ساتھ ساخت و پرداخت میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اشخاص کے کردار و گفتار میں یہ سلسلے بہت کام آتے ہیں۔ ان کا یہ نسب نامہ تفکیرِ دینی اور بینش کی برگزیدگی کی علامت ہے۔ اس فیضان کو نظر انداز کر کے ان کے اسالیبِ فکر کی باز آفرینی سعی رائیگاں ہی نہیں معنویت سے بھی محروم قرار پائے گی۔

رشید احمد صدیقی کے قائم کردہ کچھ ثقافتی معیار ہیں۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے ادیب نے اقدار شناسی کے اتنے میزان فراہم نہیں کیے۔ انھوں نے ایک منہاج متعین کیا ہے کہ کسی فرد کی عظمت کا مدار برگزیدہ اشخاص سے اس کے فکری رویے یا روابط پر قائم ہے، اور اسی سے اس کی شناخت ہوتی ہے۔ سیر نگاروں نے اسے ایک کلیّہ قرار دیا ہے۔ رشید صاحب کہتے ہیں کہ اقبالؔ کی عظمت کی ایک بڑی وجہ پیغمبرِ اعظم و آخرؐ سے ان کی والہانہ جذباتی و فکری وابستگی ہے، گویا اقبالؔ نے اپنا تعلق کونین کے سب سے مقدس انسان سے قائم کیا ہے۔ ذرا اسی پیمانۂ قدر پر رشید صاحب کو بھی پرکھیں تو خود ان کی فکر و تخلیق کا قابلِ ذکر سبب ذی وقار اشخاص سے ہی وابستہ ہے۔ ایک طرف ان کی تحریروں میں خود سیدِ کونینؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ وہ ذاتِ کبریا سے شکر و شکایت کر سکتے

ہیں لیکن پیغمبرؑ کے حضور لب کشا نہیں ہوتے۔ بعدازاں اقبالؔ سے ان کے جو ذہنی اور ذاتی مراسم ہیں وہ کسی سے نہیں۔ غالباً یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ عصرِ حاضر میں رشید احمد صدیقی کی طرح کوئی دوسرا صاحبِ طرز ادیب نظر نہیں آتا جو علامہ اقبالؔ سے یہ جذبۂ عقیدت وارادت رکھتا ہو۔ اقبالؔ کی محبت بھی دیکھئے کہ انھیں رشید احمد صدیقی کے تخلیقی نمود کا بھرپور ادراک تھا۔ تیس بتیس سال کی عمر اور یہ وفورِ شوق کہ ۱۹۲۵ء میں رشید احمد صدیقی علامہ سے ملنے لاہور گئے اور علامہ بھی رشید احمد صدیقی سے ملنے کے لیے ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ ان کی رہائش گاہ پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ملاقات کے علاوہ علامہ اقبالؔ کی بشارت بھی ان کی تحریر میں ملتی ہے۔ گویا علامہ نے رشید صاحب کی ابتدائی تحریروں سے ہی ان کے درخشاں مستقبل کے دلکش اسلوبِ زندگی کا اندازہ لگالیا تھا۔ ان کے سفارشی خط کی یہ عبارت غیر معمولی انکشاف کرتی ہے:

> "He has always struck me as a prose writer and critic of great promise. His prose has a kind of quite humour and freshness, which I hardly find in his contemporaries of the younger school."

رشید صاحب کی فکرافروز عقیدت دیکھئے:

> ''رسولِ اکرمؐ کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی افلاطونِ عہد، صاحبِ سریر وسلطنت یا اربابِ **شریعت** وطریقت کا نہیں **بلکہ** اردو کے ایک شاعر اقبال کا انتخاب کیا جس نے پیغمبری کی لیکن جسے پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔'' (علی گڑھ کی مسجد قرطبہ)

رشید صاحب پہلے استاذ ہیں جنھوں نے علامہ کی زندگی میں ہی ان کے فکروفن پر کئی مضامین **قلم** بند کیے۔ یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ دونوں جملہ خاصانِ فن میں ممتاز ہیں۔ ایک نے شعری زبان اور دوسرے نے نثری اسلوب میں تخلیقِ ہنر کے لازوال نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان میں مماثلتیں بھی عجیب وغریب ہیں۔ ایک نمایاں اشتراک دونوں کا ثقافتی اقدار سے بے پناہ عشق ہے، جو پرستش کی حد تک رگِ خون میں رواں ہے۔ ان کے فکری ارتفاع میں اسے قدر اولیٰ کی

حیثیت حاصل ہے۔ ان کا سرچشمۂ فن اسی سے فیضیاب ہے اور اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو ان کے فکر وفن میں ثقافتی اقدار ہی موضوعِ اظہار ہیں۔ ان کی تحریروں کی تابکاری یا سوز وسازِ آ گہی اسی کے نور سے روشن ہے۔ یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ بیسویں صدی کے ادبی سرمایے میں ثقافت سے یہ والہانہ سروکار کسی اور کی نگارشات کا عنوان نہ بن سکا۔ ادب کی تفہیم ہو یا شخصیتوں کا سراپا طنز کے نشتر ہوں یا تاریخی آثار، سب میں اسی خروشِ احساس کی کارفرمائی ہے۔

رشید احمد صدیقی کو صرف طنز ومزاح نگار یا انشا پرداز سمجھ لینا اس تاثر کی بوالعجبی ہے جو اسی یافت پر مطمئن ہے، اور اس اضطرابِ پیہم کو نہیں دیکھتی جو ان کے قلب ونظر میں تلاطم برپا کیے ہوئے ہے۔ اقبالؔ کے بعد رشید احمد صدیقی اکیلے ادیب ہیں جن کی تحریروں میں فکر ونظر کی تب وتاب ایک صدائے دردناک بن گئی ہے۔ دردمندی اور سوز وگداز کی شدت کے اسباب پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی ان کے اسلوب کو تخلیق کے لیے نمود بخشتا ہے اور اظہار کا سبب بھی بنتا ہے۔ اقبالؔ نے تو غمِ ملت کا اظہار کر کے اپنے سوزِ دروں کے لیے جواز فراہم کیا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے لیے کسی علامت کا انتخاب تو نہیں کیا لیکن مسائل اور مخاطب وہی ہیں۔ عمر کی پایانی کے ساتھ ان کا درد وداغ قلبِ حزیں کا نالۂ دلدوز بنتا گیا۔ ان کے سوزِ دروں کی مختلف کیفیات کے ادراک کے لیے ان کے نہاں خانۂ دل میں اترنا پڑتا ہے۔ ان کی تحریریں بے کراں اثرات کی حامل ہیں جن میں درد وکرب کی ایک حکایتِ خوں چکاں موجود ہے۔ ان کی فکر واظہار کا یہ تخلیقی رمز مختلف اصناف میں بیان ہوتا رہا ہے۔ خواہ وہ خاکہ نگاری ہو یا خطبات، انتقادیات ہو یا مزاح، ان کی پوری شخصیت کا تجزیہ اسی وسیلے سے ممکن ہے اور ان کی تحریروں کی ترسیل میں اس اساسی نقطے کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کے استفسار نے ادبی تخلیق کے رموز پر ایک سوال قائم کیا ہے۔ جو فن کی ابدیت واثر آفرینی کے ساتھ اس کے وجود اور اظہار کے سرچشموں کی تلاش یا سراغ پر مبنی ہے:

سخن میں سوزِ الٰہی کہاں سے آتا ہے؟

کا جواب رشید صاحب کے نزدیک اقدار کے اعتراف میں بغایتِ کمال موجود ہے۔ یہ سوزِ دروں آشفتہ بیانی کی صورت میں اظہار کی اوّلین صورتیں اختیار کرتا ہے۔ بعد کے حالات نے

انھیں خون نابہ فشانی کے لیے آمادہ کیا اور آخرکار وہ حکایتِ غم دل بیان کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی خندہ لبی چند برسوں بعد گہری سنجیدگی، خلوت نشینی اور کم آمیزی میں بدل جاتی ہے، وہ حالات کے جبر کو دلِ پُرخوں میں تحلیل کرتے ہیں۔ پیرایۂ اظہار میں بھی تغیر رونما ہوتا ہے۔ وہ تہذیبی عروج وزوال اور معاشرتی نشیب وفراز کے اسباب وعلل پر مفکرانہ رویہ اپنا لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ زندگی کے کسی دور میں بھی ان مسائل سے دست بردار نہیں ہوئے مگر بعد میں یہ رنگ کچھ ایسا غالب ہوا کہ دوسرے عنوانات ثانوی بن گئے اور ان سے التفات کم سے کم ہوتا گیا۔ اس ذہنی تبدیلی کی داستان بڑی دلخراش ہے۔ جس سے اردو سماج کا تقریباً ہر فرد دوچار تھا۔ بالخصوص وہ افراد جو زیادہ حساس اور دردمند دل کے مالک تھے۔ انھوں نے غم واندوہ کو انگیز کیا ان کے اعصاب بھی جواب دینے لگے مگر چار وناچار یہ سب کچھ سہنا پڑا۔ رشید احمد صدیقی نے جس طرح محسوس کیا اس کی مثال ادب کے کسی تخلیق کار کے یہاں نہیں ملے گی۔ سماجی انتشار سے رشید صاحب کے اعصاب بھی متاثر ہوئے۔ ان کے اسباب کی نوعیت بھی جداگانہ تھی۔ ایک معاشرے کے حساس، زندہ اور پرسوز طبیعت رکھنے والے نثر نگار کی حیثیت سے انھوں نے اس کے عوامل پر بھی غور وفکر کیا، وہ خود اقرار کرتے ہیں:

> ''علی گڑھ اور علی گڑھ کے باہر چالیس بیالیس سال میں واقع ہونے والے چھوٹے موٹے واقعات سے بہت متاثر ہوا۔''
>
> ''پچھلے پچاس سال میں جتنے شدید اور عالمگیر تہلکے یکے بعد دیگرے برپا ہوئے اور جنھوں نے ہمارے ذہن اور زندگی کو جس سفاکی سے زیروزبر کیا اس کی نظیر تاریخِ انسانی میں نہیں ملتی۔''
>
> ''دراصل یہ آویزش صلیبی جنگ سے شروع ہو کر پہلی جنگِ عظیم پر ختم ہوتی ہے۔ گو فتنہ سامانی کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں اب تک جاری ہے۔''

''آشفتہ بیانی میری'' کے یہ حوالے ان کی سوچ اور اضطراب کی جن کیفیات کا پتہ دیتے ہیں ان کی جستجو مشکل نہیں مگر ان کی بازآفرینی کے بغیر رشید صاحب کے اسلوب وانشا کی تفہیم بھی ممکن نہیں ہے کرب کی انھیں کیفیات نے ان کے قلم کو جولانی بخشی ہے۔ وہ تہذیبِ حجازی کے

جلال و جبروت کی آغوش میں پروان چڑھے۔ شیرازِ شرق کی پرشکوہ عمارتوں کے سکوت میں ابتدائی ذہن نے پرورش پائی۔ ایوانِ شاہی کے آثار نے ان کے قلب ونظر کی دنیا میں ماضی کی عظمتوں سے عقیدت پیدا کی۔ مقابر اور مساجد نے سکون وثبات کے راز سمجھائے، سنسان بوسیدہ کھنڈرات نے ہستی و نیستی کے راز فاش کیے۔ انھیں کے درمیان علمی اور ثقافتی اداروں کے نشیب وفراز بھی دیکھے گومتی کے کنارے کشتیٔ انسان کو منجدھار میں ڈوبتے اور نکلتے بھی دیکھا۔ شعرا کی بزم خوانی، علما کی منزہ محفلوں، اہلِ دل کی خانقاہوں نے بھی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ دیارِ شرق انھیں تہذیبی علامتوں سے اپنی شناخت کے لیے معروف ہے اور اس کے گرد و نواح کا قصباتی معاشرہ اور اس کی جملہ خصوصیات نے ان کے طرزِ فکر کو ایک نئی جہت دی۔ انھوں نے خودنوشت میں قلم بند کیا ہے کہ شعور کی تشکیل میں شاہی آثار باقیاتِ پارینہ کے کھنڈروں اور دریائے گومتی کے سکوتِ شام کو بڑا دخل ہے۔ دیر تک ایک خاص محویت میں وہ اپنا وقت گزارتے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ ایسے منظر میں چشمِ جہاں بینِ خلیل روشن تر ہو جاتی ہے:

وہ سکوتِ شام صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

شاہانِ شرقی کی پرشکوہ عمارتوں کی خاموش فضا میں انھیں بڑی انسیت محسوس ہوتی۔ وہ ثقافتی ارتفاع اور انحطاط کا احتساب بھی کرتے۔ ایک زود حس اور ذی شعور انسان کے دل و دماغ میں درد و کرب کا پیدا ہونا فطری میلان بنتا گیا۔ ماضی کے گذشتہ روز و شب سے ان کی وابستگی بھی بڑھتی گئی۔ عنفوانِ شباب کی تنہا نشینی اور پایانِ عمر کی خلوت گزینی میں زیادہ فرق نہیں محسوس ہوتا۔ اسی میں ان کی کم آمیزی کا بھی جواز ملتا ہے۔ اسلاف کے پیکار اور فتوحات کا وہ دورِ پرشکوہ اور بیسویں صدی کی یہ محکومی اور معذوری رشید صاحب کو اکثر احتساب کے لیے مجبور کرتی ہے۔ نتیجتاً ان کی تحریر میں سوز و ساز اور درد و داغ کا در آنا حیرت خیز نہیں۔

''شکستہ تاریخی عمارات، آثارِ قدیمہ دیکھ کر میں بہت متاثر ہوتا ہوں جیسے ان کے آگے جھکنے اور گلے لگا لینے کو دل چاہتا ہے۔''

''جون پور میں جو آثارِ قدیمہ دیکھے تھے اور دیکھا کرتا تھا اور ان کی جیسی منزلت

دلی میں تھی۔ آگرہ اور دہلی کے قلعے، مقبرے اور مسجدوں نے ان کی تصدیق کردی۔" (علی گڑھ کی مسجدِ قرطبہ)

پرشکوہ ماضی کا ایک اظہار وہ شعری محفلیں بھی ہیں جن میں مرثیہ کی رزم خوانی، حق و باطل کی معرکہ آرائی اور شہادتِ حسینؓ کا واقعہ بھی ہے جس کے بطن سے انقلاب جنم لیتا ہے اور ان سے قوموں کی تقدیریں بدلتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں نعرۂ اللہ اکبر مردانِ حق کی جاں سپاری، شر کی شکست، چمکتی ہوئی تلواروں میں سایہ نشینی، دعوت وعزیمت کی سر بلند داستانوں کی تمام تلمیحات کا جواز اسی سبب ہے۔ ان کے نزدیک جہادِ زندگانی میں ٹوٹی ہوئی تلواریں، بجھی ہوئی آگ، نیم سوختہ لکڑیاں، اجڑے ہوئے خیمے، بکھرے ہوئے اسبابِ حرب وضرب، شوقِ شہادت، مردان حر کی اذانیں، مالِ غنیمت اور کشور کشائی سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہیں۔ بلکہ ان تاریخی واقعات سے رشید صاحب نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے ان کے اسلوب کا آب وتاب ان حادثات سے بڑی گہری معنویت حاصل کرتا ہے۔ ان کی عبارت کا یہ حوالہ صرف اردو نہیں بلکہ پورے تاریخی سرمایے میں ایسی بلاخیز معنویت کا حامل نظر نہیں آتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثے کی ابدیت رشید صاحب کے لیے بڑی دلکشی رکھتی ہے۔ کشمکشِ زیست میں ان کا رویہ نبرد آزمائی کے نوید سے بھرپور ہے۔ غیروں کے ساتھ ساتھ کچھ اردو کے فریب خوردہ انقلابی ادیبوں نے بھی رسمِ خط میں تبدیلی کی حمایت شروع کی، رشید صاحب نے فی الفور متنبہ کیا:

"ادب، تہذیب اور اقدار کی حفاظت کا معرکہ ہو تو رخ کربلا کی طرف رکھتے ہیں، کوفے کی جانب نہیں۔ جہاد کا سامنا ہو تو خانقاہ میں بیٹھنا ممنوع ہے۔"

آزادی کے بعد نیم جاں اردو معاشرہ جن صبر آزما کیفیات سے دوچار ہوا۔ اس سیاق میں اس سے بہتر کوئی تاریخی حوالہ معاون نہیں ہوسکتا تھا اس مضمون میں ایک اہم تاریخی واقعہ سے رشید صاحب نے بہت ہی فکر انگیز استنباط کیا ہے:

"سنتے ہیں کہ حضرتِ اسماعیلؑ کی ایڑیوں کی رگڑ سے زمزم کا چشمہ جاری ہوا تھا دیکھئے ہماری آپ کی تگ ودو سے کیا برآمد ہوتا ہے؟"

ایک طرف آثار وکھنڈرات کی عظمتوں نے ان کی دنیائے فکر کو سوز وگداز بخشا دوسری

جانب ماضی کی روایات نے قلب ونظر کی پنہائیوں میں پناہ گاہیں تعمیر کیں۔ اس صدی کا کون ادیب ہے جس کی تحریر وتکشف میں ثقافتی ایما واشاروں نے جہانِ معنی کو جنم دیا ہو۔ یہ صرف ان کے اسلوب کی معجز نمائی نہیں ہے کہ وہ مختصر جملوں میں فکر کے بے کراں مفہوم کو مقید کرتے ہیں۔ ان جملوں کی ساخت پر نہ جایئے ان میں موجود معانی کی تہ در تہ سطحیں ملاحظہ کر کے محسوس کریں تو یقین آئے گا کہ یہ طنز نہیں، مزاح نہیں اور نہ خندہ لبی ہے بلکہ احساس کو آتش ناک بنانے کا وسیلہ ہے جس سے خود فن کار بھی مضطرب ہے۔ نثر کی یہ خارہ گدازی دوسری جگہ خال خال بھی نہیں ملتی اور نہ معانی کی فکر انگیز سیلابی کیفیت ہی کہیں پائی جاتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے خاکے کی اختتامی عبارت دیکھئے یا مولانا سید سلیمان ندوی کے خاکے کا آخری جملہ ملاحظہ فرمایئے۔ مشرقی پاکستان میں اردو کی مخالفت کا ہنگامہ جاری تھا۔ سید سلیمان ندوی کا وہاں کے عوام سے خطاب کرنا اور شر پسندوں کی طرف سے مولانا کا عدم احترام۔ اس پس منظر میں حدیثِ پاک کی معروف عبارت سے استفادہ کرتے ہوئے مفہوم میں ایک فکر آفریں تغیر نے خاکے کے تاثرات کو شدتِ احساس کی بے پایانی بخش دی ہے۔ اس المیہ کا اس سے بہتر اختتام ممکن نہیں ہے۔

> ''اگر ایک عالم کی موت ایک عالم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کیا ہوگی؟''

یہ صرف مترادفات، ہم آواز الفاظ، یا متضاد لفظوں کے اجتماع یا صوتیاتی آہنگ کا ہنر نہیں ہے بلکہ ان کے پیچھے ان کا زبردست فکری رویہ کارفرما ہے۔ جس کی تشکیل میں ثقافتی روح جاری ہے۔ جس کی باز آفرینی میں معاصر سے کہیں زیادہ ماضی محرک اور معاون دکھائی دیتا ہے۔

جون پور صرف شاہانِ شرقی کا دارالخلافہ ہی نہیں رہا ہے بلکہ بغداد، غرناطہ، قرطبہ کے زوال کے بعد اسلامی علم ودانش کا یہ عظیم مرکز، مرجعِ خلائق رہا ہے۔ اکابرین علما کا ایسا اجتماع برصغیر کی تاریخ میں کہیں اور نہیں دیکھا گیا۔ بلادِ اسلامی کے علمی اور روحانی قافلے اتنی طویل مسافت طے کر کے دوآبہ کے آخری کنارے آباد ہوئے اور علم وآگہی کا قندیل روشن کیا۔ عالم اسلام کے بے مثل مفکر عالم شاہ ولی اللہ نے اپنے عربی قصدے میں اعتراف کیا ہے کہ جون پور سے علم ودانش کی ہوائیں چلتی ہیں تو قلب ونظر عرفان سے منور ہوتا ہے:

مــن جــو نـفـورا ذَهَبَتْ ريــاحُ رِضـى
مِـنْـهَــا تـعَـطَّـرتِ الـدُّنُيــا وَمَــا فِيُـهَــا

''تاریخ مشائخِ شیراز ہند'' کے مصنف ڈاکٹر میاں محمد سعید نے ''صبحِ صادق'' مخطوطہ برٹش میوزیم لندن کے حوالے سے نظم کے چند اشعار نقل کیے ہیں:

جنت عدن جون پور بود | کا ندر آنجا مقامِ حور بود
مسکنِ علم وفضل ودانش و رای | نبود آں چناں بملک خدائی

بارہویں صدی عیسوی سے قبل اسے ایک مرکزیت حاصل ہو چکی تھی۔ اگر سید سالار مسعود غازی کی مہم جوئی پر پڑے دبیز نیم تاریخی پردے اٹھا دیے جائیں تو شاید اس کا سلسلہ صدیوں قبل وقدیم ٹھہرے ان کی تسخیر وطاقت کے تذکرے گاؤں گاؤں دہرائے جاتے ہیں۔ ان کے پرچم اور علَم کو گھر گھر گھمایا جاتا ہے۔ ملنگوں اور قلندروں کے قافلے نشانِ فتح کے ساتھ رواں دواں رہتے ہیں۔ اقبال کے آب رودِ گنگا کے کنارے کارواں کے اترنے کی تعبیر یہاں تلاش کی جاسکتی ہے۔

خاندان تغلق کے آخری فرماں روا فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۶۲ء میں اس شہر کو آباد کیا چچازاد بھائی جونا خاں کے نام سے اسے نسبت دی گئی۔ امارت واقتدار میں تبدیلیاں آتی رہیں۔ شرقیوں کی فرماں روائی میں پورا علاقہ شرقی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ علم وفن کا ارتکاز شروع ہوا تقریباً ڈیڑھ سو سال تک شاہانِ شرقی کی حکومت نے اسے دمشق وبغداد کا حریف بنا دیا۔ فتوحات کے بعد ہمایوں اور اکبر نے بھی اپنی آمد سے اسے سرفرازی بخشی۔ 'تاریخِ فرشتہ' میں اسے دہلی ثانی کہا گیا ہے۔

مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات سے ہی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ زبان وبیان پر بھی اس کے اثرات ناگزیر تھے۔ اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما کے خدوخال پر نظر ڈالیے تو بہت حد تک اودھی سے اردو کی تشکیل کے نظریہ کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ نواحِ جون پور میں مستعمل ذخیرۂ الفاظ کا ایک حصہ ولی اور شاہ حاتم کے معاصرین کے کلام میں موجود ہے۔ اس لسانی رشتے کا تجزیہ غور طلب ہے خود رشید صاحب کی تحریروں میں مقامی زبان کے الفاظ نے ان کی معنویت میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ یہ الفاظ صرف یوں ہی نہیں در آئے ہیں بلکہ زبان وبیان کی وسعت طلبی کا فطری تقاضا تھا جسے بروئے کار لایا گیا ہے۔ کیونکہ ان کا متبادل وہ لطف نہیں دیتا جو

سیاق کی ایمائیت کے لیے لازم ہے۔ یہ سب کو تسلیم ہے کہ لفظوں کے استعمال وانتفاع میں رشید صاحب سب سے الگ اور بہت ممتاز ہیں۔ ان کی پشت پر ادبیات کی ایک مہتم بالشان وراثت ہے۔ سید مبارک شاہ جو ۸۰۳ ہجری میں تخت نشین ہوا، شاعر تھا۔ اسی دور کا شاعر ملک عزیز اللہ بسطامی ہے جس کا نایاب کلام پروفیسر نذیر احمد نے فکر ونظر ۱۲، شمارہ ۳، ۱۹۷۲ء میں پیش کیا ہے۔ مدھومالتی کے مصنف شیخ منجھن شیخ قطب علی قطبن سلطان حسین شاہ شرقی کے درباری شاعر تھے۔ کبیر، جائسی، عبدالرحیم خاں جاناں، تلسی داس، شیخ علی حزیں، میر حسن، تلامذۂ غالب وداغ، انیس ودبیر، شبلی اوران کے مقتدر جانشینوں کی تخلیقات آج بھی یکتائے روزگار ہیں۔

شیر شاہ سوری نے اٹالہ مسجد میں قاضی نظام الدین کی شاگردی اختیار کی۔ عہد جہانگیر کے عثمان غازی پوری نے ''چترا ولی'' عشقیہ داستان لکھی۔ شیخ بنی کی 'گیان دیپ' بھی اسی دور کی عشقیہ داستان ہے۔ صبر حد کے نور محمد نے بعد میں اندراوتی لکھی۔ جو ایک طرح پدماوت کے طرز میں ہے۔

شاہ جہاں کو تخت نشینی ۱۶۲۵ء کے بعد یہاں کے فضلا سے خاص عقیدت پیدا ہوئی۔ نصیر الدین اودھی کو دہلی کا چراغ کہا جاتا تھا۔ شاہ جہاں ان کی زبانِ اودھی کو زبانِ مرشد کہتا تھا۔ وہ برسرِ منبر چندائن کے اشعار پڑھتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے استاد ملا جیون اسی شہر سے نسبت رکھتے ہیں۔

اس دیار کی بے مثل علمی اور فکری فتوحات پر نظر رکھیے۔ ملا محمود جون پوری کی شمسِ بازغہ اسلامی فلسفہ کی اساس کی حیثیت سے معروف ہی نہیں، علمی نصاب کا جزو رہا ہے۔ علامہ اقبال نے فلسفہ زماں ومکاں کے سلسلے میں اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ خطوط میں حوالہ ملتا ہے۔ مولانا محبّ اللہ الہ آبادی کی شرح فصوص الحکم ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھیں مباحث سے متعلق تسویہ بھی تصنیف کی گئی۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں کئی نامور علما اس نواح کے باشندے ہیں۔ گنجِ رشیدی اور تدبرِ قرآن کی ضخیم جلدیں یہیں مرتب کی گئیں۔ حدیثِ پاک کا قدیم اورنایاب ترین ضخیم مخطوطہ ''المصنف'' یہیں سے برآمد ہوا ہے جسے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مرحوم نے سات جلدوں میں مرتب کرکے بیروت سے شائع کیا ہے۔ عہد فیروز شاہی کی زبدۃ

الفقہ کا مخطوطہ بھی یہیں سے دستیاب ہوا۔ تجلّیٔ نور، لطائفِ اشرفی، دیوانِ حافظ، دیوانِ امیر شاہی سبزواری، تذکرۂ الٰہی، تذکرۂ شورش جیسے بیش بہا اور نایاب نسخوں کی بازیافت اسی شہر کی مرہونِ منت ہے۔ ان حوالوں سے حاصل یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی براہِ راست اس علمی بارِ امانت کے امین تھے۔ اس احساس نے ان کے اسلوبِ فکر اور تحریر کو جولانی بخشی ہے جسے بعض لوگوں نے بر بنائے تنگ نظری ان کی خودنگہی اور جاہ پرستی سے تعبیر کیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ان کے اسلوب کی جاں گدازی اور تصورات کے اظہار میں عجزِ بیان بہت نمایاں ہے۔ ذاکر حسین اور مولانا آزاد پر نظر رکھنے والے کندن، حسرت، اصغر اور مولانا شیث کو بہ سہولت نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان سب کے بیان میں ان کے اعلیٰ اقدار کی ترجمانی ہے۔ اقدار کی پروقار وراثت رشید صاحب کو ان کے ماضی و ماحول نے بڑی فیاضی کے ساتھ بخشی ہے۔

معاصر علماء میں مولانا شیث کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالاول، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا عمادی، مولانا سراج الحق مچھلی شہری، مولانا ابوالحسن علی ندوی نابغۂ روزگار موجود تھے۔ ان حضرات کی سیکڑوں تصانیف نے تحریکِ علمی کا غلغلہ بلند کیا تھا۔ ان سب سے رشید صاحب کے گہرے روابط بھی تھے۔ اس نور فشاں منظر سے علم و دانش کی محفلیں قریہ وقصبات کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔ گاؤں گاؤں میلاد، مجلس اور مشاعرے منعقد ہونے کی مثال کثرت سے ملتی ہے۔ ظریف لکھنوی کی نظم 'گاؤں' کا مشاعرہ اسی ادبی تاریخ کا اسلوبِ اظہار ہے:

تیری شرکت لازمی ہے شہر میں ہر گاؤں میں

رشید صاحب کے بزرگوں کا ضمیر اقتدار اور اجلال کے خوف و خطر سے نبرد آزما رہا۔ اکبر اعظم کے دینِ الٰہی کو تسلیم نہ کرنے اور اعلائے کلمۃ الحق کے اظہار پر جمنا میں غرقِ آب کیا جانے والا عالم جون پور کی زمین کا پروردہ تھا۔ انگریزی سامراج کو بحرِ اوقیانوس میں غرق کرنے والے مجاہدینِ آزادی میں سید احمد شہیدؒ کا نام روشن ہے۔ ان کے معتقدِ خاص مولانا کرامت علی کی انگریز دشمنی اور باغیانہ سرکشی کی داستان سے ہر پیر و جواں واقف ہے۔ تبلیغ دین اور احیائے دین کے پردے میں ڈھاکہ تا برما ان کا عزم بیداریٔ دین و دنیا کے آغوش میں پرورش پا رہا تھا۔ یہ سیاسی بصیرت اور تطہیر سے منسوب ہیں، بہار، بنگال اور برما میں دین کی ترویج میں جون پور کے علما کا

سب سے بڑا اکتساب ہے۔ شہر کی مختلف بستیاں صرف علمائے دین سے آباد تھیں ان میں ملاٹولہ اور مفتی محلہ خاص ہیں۔ یہ تخصیصِ سکونت شاید ہی کسی شہر کے نصیب میں آئی ہو۔ پھر ان کے ان گنت مدارس اور رشد و ہدایت کے مراکز سے یہ معمورہ رشکِ بغداد بنا ہوا تھا۔

غازی پور میں ہی سرسید نے مدرسے کا خاکہ تیار کیا تھا اور سائنٹفک سوسائٹی کا قیام بھی اس سرزمین کی سوچ کا نتیجہ ہے۔ فوز و فلاح کا یہ فیضان آج بھی دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ شعری و ادبی تخلیقات سے قطعِ نظر صرف علمی مراکز پر نظر ڈالیں تو حیرت انگیز حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ چھوٹے سے شہر میں مسلمانوں کے تین پوسٹ گریجویٹ کالج ہیں، پڑوس میں شبلی کالج اعظم گڑھ ہے جو انتظام و انصرام میں کسی بڑی دانش گاہ سے کم نہیں ہے۔ بلکہ علی گڑھ سے ڈھاکہ کے درمیان اس شان کا کوئی دوسرا مسلم ادارہ نہیں ہے۔ الہ آباد، جون پور، بھدوہی، مئو، گورکھپور میں لڑکیوں کے ڈگری کالج مستزاد ہیں۔ دوسری طرف مرجعِ انام اور مینارۂ علم کی بلندیوں پر فائز دینی اداروں کی یہ کہکشاں بھی شاید ہی کہیں ملے۔ تقریباً سو میل کے محور میں پر وقار مدرسوں کی خدمات بے نظیر ہیں۔ جامعۃ الفلاح، جامعۃ الاصلاح، جامعۃ الرشاد، جامعہ سلفیہ، جامعۂ عالیہ، گورینی اور جامعۂ حسینیہ، مصباح العلوم وغیرہ کے مدرسے علمی خسروی کے نشانِ سریر و سلطنت ہیں۔ شاہانِ شرقی کے زوال کے بعد آج تک اس نواح کی علمی فضا بدستور باقی ہے۔ شاہ جہاں نے اسے شیرازِ ہند اور دارالعلم کا لقب دیا تھا، جسے غلام حسین نے جون پور نامہ میں محفوظ کیا ہے۔

رشید صاحب کی تحریروں میں اس علمی فضا کا ذکر ایک انبساط و آہنگ پیش کرتا ہے ان کے مزاج کی تمام جلوہ سامانی اور تمکنت جبینِ نیاز کے ساتھ ان بزرگوں کی تکریم میں جھک جاتی ہے۔ قدر شناسی کے پرستار کی حیثیت سے ان کے اسالیبِ بیان میں یہ عنصر ہمیشہ نمایاں رہتا ہے نہ وہ بے تکلف ہوتے ہیں اور نہ ہی اجازت دیتے ہیں۔ چاہے وہ طلبہ کا مسئلہ زیرِ بحث ہو یا تنقید و تفہیم کا۔ اقدار سے خالی تخلیق و تنقید گمراہی پھیلانے کا موجب بنتے ہیں اور ہر حال میں مہلک اور مذموم قرار پاتے ہیں۔ اقدار پرستی کے اس پیکر کو ثقافت سے جو والہانہ شغف ہے وہی ان کی فکر کا مرکزی خیال اور اسلوب کا اساسی امتیاز ہے۔ شعر و فن اسی سے منزہ اور متحرک ہو کر ابدیت کے پیکر میں ڈھلتے ہیں۔ جو سلسلۂ فکر انسانی کے ارتقائی عمل سے مربوط ہوتے رہتے ہیں ان تصورات کی

وضاحت ''غالب شخصیت اور شاعری'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

انھوں نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ اسکول کی عمارت نہ ہونے کی وجہ سے کچھ دنوں منڈیاہوں کے مندر میں تعلیم حاصل کی۔ وہ تراشیدہ سنگی مجسّموں کو چھوتے اور بہ غور دیکھتے۔ جو لوگ آس پاس کے جغرافیائی حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ بہت تھوڑے فاصلے پر بندھیاچل کی پہاڑیوں کا سلسلہ دور دراز تک پھیلا ہوا ہے جس کے آغوش میں اب رودِ گنگا رواں ہے، اور لبِ آبِ گنگا مرزاپور آباد ہے۔ پورے نواح کی معیشت اور ثقافت میں ان سنگ لاخ پربتوں اور پتھروں نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ معبدوں، شاہراہوں اور سنگِ میل بن کر یہ جادۂ زندگی کی مسافتوں کو طے کراتے ہیں۔ یہ مسجدوں، معبدوں، مزاروں، مکانوں غرض روز مرہ کی گھریلو اشیا کے علاوہ انسانوں کی حیات بخش شکم سیری کے لیے گھریلو چکی، اناج پیسنے کی مشینوں، تیل نکالنے اور گنے سے رس نکال کر، گڑ، کھانڈ، راب اور شکر سے ہر ذی حیات از مور و مگس تا فیلِ بے زنجیر کو بھی فرحت بخش شیرینی فراہم کرتا ہے بلکہ پس از ممات یہی ارمغانِ نذر منتوں، مرادوں کی تکمیل کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ ان پتھروں کی افادیت سجدہ گاہوں، محراب و منبر یا مورتیوں کے تقدس تک ہی محدود نہیں ہے فلک بوس عمارتوں کی تعمیر کے لیے کنکر پتھر کو پیس کر پائیدار مسالا تیار کرنے والے کولہو کی کارگزاری سے ہم واقف ہیں۔ اس کولہو پر بھی نظر ڈالیے جس سے گلاب و یاسمین بیلا موتیا اور کیوڑے کی روح کشید ہوتی ہے۔ عرق اور خوشبوئیں تیار کی جاتی ہیں۔ سنگِ خارہ کی یہ نرم و نفیس اور نازک و لطیف تخلیق بھی توجہ طلب ہے جس سے جون پور کی عطر سازی اور خوشبوؤں کی کشید نے شائقینِ عالم کو محویت میں مبتلا کیا ہے۔ ایوانِ صدر اسلام آباد میں ۱۱/نومبر ۱۹۸۰ء کے عشائیہ سے قبل ناچیز کے تعارف میں ڈاکٹر محمد حسن نے صدر پاکستان کو بتایا کہ راقم جون پور کا باشندہ ہے۔ اس شہر کا نام آتے ہی صدر پاکستان نے فرمایا کہ کسی عالمی مجلس میں صدر جمہوریۂ پاکستان جنرل ضیاءالحق مرحوم کی ہند کے وزیر دفاع بابو جگ جیون رام سے ملاقات ہوئی، وزیر دفاع کے لباس میں لپٹی خوشبو نے مرحوم کو بہت متاثر کیا۔ جنرل مرحوم کے استفسار پر وزیر موصوف نے بتایا کہ یہ جون پور کا دیسی گلاب ہے جو بلغارین گلاب پر اپنی عالمی سبقت رکھتا ہے۔ مرحوم نے اپنے ہندوستانی سفیر جناب عبدالستار سے خواہش ظاہر کی اور انھیں تلاش بسیار کے

بعد بھی حاصل نہ ہوسکا۔ اس اضافی تذکرے سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ سنگ تراشی کی بدولت مجسمہ سازی کی فراواں تمثال نے رشید صاحب کے مرقعوں کی تخلیق میں بہ طور محرک رول ادا کیا ہے۔ آس پاس کے تمام علاقوں میں سنگ سازی ایک ہنر ایک پیشہ اور محبوب مشغلہ کی حیثیت رکھتا ہے جو شہر و قصبات، بازار و مضافات میں ارزانی کے ساتھ دستیاب ہے۔ سنگ تراش ایک قوم کی صورت میں ہر بستی میں آباد ہیں اور اسی پیشے سے منسلک ہیں۔ رشید صاحب کو مورتوں کے لمس اور مشاہدہ کے ادراک سے تخلیقی اظہار کے لیے بہت کچھ ملا ہے، ان کی خاکہ نگاری کا مثبت مدار بہت کچھ اس منظرنامے کا محتاج ہے۔ جس میں فکری ابتکار اور جمالیاتی انبساط کے ساتھ ثقافتی اقدار بھی ہم دوش ہیں۔ عالموں، مصنفوں، ہنرمندوں کے ساتھ قابل ذکر معبدوں کی جو کثرت اس علاقے میں ہے وہ ملک کے شرق و غرب میں معدوم ہے۔ نذر کیے گئے پھولوں کے ڈھیر کے ڈھیر سے پھیلنے والی خوشبوئیں، قرب و جوار کو معطر کرتی ہیں روح کو پاکیزگی اور جسم کو تازگی کے احساس سے پاس پڑوس کو بھی معنبر رکھتی ہیں۔ اس ثقافتی تفاعل کا تحیر دیکھئے کہ مذہبیات یا عقائد کے سرچشموں کی نمو پذیری میں برصغیر کا کوئی علاقہ اس سرزمین کا حریف نہیں ہے۔ سری رام کے اوتار کے ساتھ مہاتما بدھ ایک عالمی عقیدے کے داعی بنے۔ ایک بین الاقوامی تحریک نے اسی دیار سے جنم لیا۔ شنکراچاریہ کے تصورِ توحید کا منبع یہی علاقہ ہے۔ سید محمد جون پوری کا فرقہ مہدویہ یہیں وجود میں آیا اور افغانستان تک پہنچا۔ کبیر داس نے ایک نئے عقیدے کی بنیاد رکھی جس سے پورا شمالی ہندوستان متاثر ہوا۔ بھگتی تحریک کا حرفِ راز یہیں لکھا گیا۔ تشیع کو یہیں سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ رام بھگتی تحریک کو اسی علاقے میں اوّلیت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں منشی شیو برت لال برمن اور ٹھاکر انکول چند کے ست سنگی عقائد کی ابتدا اور نشو ونما اسی دیار کی دین ہیں۔ تبلیغِ دین کی کئی تحریکیں وجود میں آئیں، جنھوں نے برما تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا چراغ روشن کیا۔ ایک نیم ادبی و نیم سیاسی مستعار تحریک کا آبائی خمیر بھی اسی سرزمین سے وابستہ ہے۔ سید سجاد ظہیر لکھنؤ میں پیدا ہوئے مگر ان کے والد کے ساتھ گھر گھرانہ جون پور کا ہی ہے۔ خود سجاد ظہیر جون پور سے تعلق کو باعثِ برکت سمجھتے رہے۔ اس تحریک کے نشیب و فراز کی بازخوانی میں نواحِ جون پور کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ رشید صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس تحریک کو فکری و تخلیقی بنیادوں پر

مسترد کیا تھا۔ یہ ان کی بصیرت اور ژرف بینی تھی کہ تین دہائیوں کے بعد ہی مزعومہ عمارت بیت العنکبوت کی طرح بکھر گئی۔ مگر رشید صاحب کے تفکیری جملے ترقی پسندی ہی نہیں بلکہ ادب و اقدار کی نفی کرنے والی ہر تحریک کو منکرات سے باز رہنے کی منہاج فراہم کر گئے۔ تخلیق کے راہ نشیں کو رازِ الوندی سیکھنا ہو تو رشید صاحب سے رجوع کرنا ہوگا۔ ان کی تحریروں کو صرف انشائے رشیدی سمجھ کر پڑھنا کم سوادی اور کم نظری ہوگی۔ بیسویں صدی کے نثر نگاروں میں ایسے فکر آفریں جملے کہیں نہیں ملیں گے۔ ناچیز کی اس گفتگو کی تائید و تصویب کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون ''رشید احمد صدیقی ایک مفکر'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ غرض تہذیبی تلاطم اور ثقافتی افتخار نے اس روئے زمین کو بڑی ارجمندی پر فائز کیا ہے۔ رشید صاحب کو یہ وراثت دست بدست ملی اور انھوں نے بہ کمالِ احتیاط اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ موضوعات کی معنویت کے علاوہ ان کی جہات میں بڑا تنوع ہے۔ وسعتِ بیان میں مشاہدے کی بھرپور گیرائی نے مختصر جملوں کو جنم دیا ہے۔ جن میں بے کراں وسعتوں کو ارتکاز کی صورت میں پیش کرنے کا منفرد اسلوب ان کا خاصا ہے۔ معنی کی تہوں کو الٹتے رہیے تو اقوال کی صداقتوں کا ایقان ہوتا ہے۔ بعض ناقدین نے قولِ محال کی تشبیہ سے ان کے اسلوب کو متمائز کیا ہے۔ اردو ادب میں کسی دوسرے انشا پرداز کے اتنے جملے اقوال میں تبدیل ہوئے ہوں یا استعمالِ عام میں ضرب الامثال بن گئے ہوں مثال نہیں ملتی۔ خود رشید صاحب نے معروف مصرعوں کو معنویت بخشی ہے۔ جس سے وہ اور بھی عدیم المرتبت بن گئے ہیں:

سلام ہو نجد پر

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

حسن آفریں مرحبا مرحبا

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

اب کے بھی دن گزر گئے یوں ہی بہار کے

یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی

کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

بات موضوعات کی تھی ذرا چارپائی اور ''ارہر کا کھیت'' جیسے پامال عنوان کو دیکھئے بات میں بات نفسِ مضمون کی بلاغت اور پھر وسعتِ بیان کی سحر آفرینی نے انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا یہ مقامیت سے عالم گیری اور نقطہ سے دائروں میں پھیلتا جاتا ہے۔ تفہیم کے لیے ارتکاز کو عالمِ امکان سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ بہ ظاہر یہ مقامی اور محدود نظر آتا ہے جسے کئی ناقدین نے رشید احمد صدیقی کی تحدیدِ نظر سے تعبیر کیا ہے۔ علی گڑھ کے تذکرے میں تنقید کے نام پر انھیں طنز و تشنیع کا ہدف بنایا گیا۔ آفاقی نظر کی ادعیات میں مذموم تصورات کی تائید کی گئی اور اقدار کے مسلّمات سے انحراف کر کے اپنے ہی انتقادی مباحث کو لایعنی بنا دیا گیا جس کی ایسی ناقدری تاریخِ ادب میں نہیں دیکھی گئی۔ حالانکہ رشید صاحب نے اس اشکال کا بہت ہی معنی خیز جواب دے دیا ہے۔ اسی پس منظر میں اصغر گونڈوی کا یہ شعر نقل کر کے معترضین کو سکوت وسکون کی دعوتِ فکر دی ہے:

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

علی گڑھ کی مقامیت نے ہی بین الملل کے مسائل سمجھنے کی اساس فراہم کی اور دنیائے دوں میں خلل برپا کرنے والے سیاسی وثقافتی عیاریوں کو محسوس کرایا۔ ایشیا، یورپ، امریکہ، بغداد، بیت الحرام، قرطبہ، نجد، سمرقند کا ذکر آفاقی نظر کی وجہ سے ہے۔ منشی پریم چند کی تگ وتاز بنارس اور کان پور سے آگے نہیں ہے۔ مگر کیا ان کی آگہی آفاقی مسائل سے عاری ہے۔ ہر فن کار اپنی آگہی سے آفاقی دروں بینی کا کام لیتا ہے۔ یہ نظر کی ساحری نہیں، مشاہدے کا فیضان ہے۔ یوں بھی رشید صاحب نے جن اقدار کے درمیان پرورش پائی تھی ان کے اجتماعی ارتباط کا مرکز محسوس علی گڑھ ہی ہے۔ اس سے صرفِ نظر کر کے شاید ہی کوئی اسلوبِ فکر قابلِ قبول ہو سکا ہو۔ ادبی اسلوب میں یہ علامتی اظہار ہے۔ رشید صاحب حقیقت اور علامت دونوں طرح سے اسے ایک منہاج مانتے ہیں

اور مبداء فیض رسانی بھی، جس سے دور ونزدیک یا ملک و بیرونِ ملک کے ہزاروں لاکھوں جوانانِ ملت نے علم وآگہی، خودنگری و جہاں بینی کے سبق سیکھے ہیں۔ اور پورے عالم کو جہاں تاب کیا ہے۔ قوموں کے ضمیر اور ملتوں کے خمیر میں کسی مقام سے استواری استحکام واستقلال کا باعث بنتی ہے۔ ورنہ شاخ سے گرے ہوئے خزاں رسیدہ پتوں کی مانند ہوا کا ہر جھونکا انھیں بکھیرتا رہتا ہے۔ زمانۂ حال میں جغرافیائی حدود کے خلاف باغیانہ افکار رکھنے والے شاعر نے بھی مرکزِ محسوس کو آفاقی نظر کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ اور پیامِ مشرق، کی ایک خوش آہنگ نظم میں آفتاب کی تمثال سے مزید وضاحت کی ہے کہ سورج اگرچہ مشرق و مغرب کے حدود سے آزاد ہے اور سارے عالم کو اپنی شعاعوں سے روشنی بخشتا ہے مگر خاور سے اس کی ایک تکوینی نسبت ضروری ہے:

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او ازروئے نسبت خاوری است

ویسے بھی انھوں نے سوادِ اعظم کی دو اہم ترین تہذیبی فضاؤں کے درمیان سب کچھ دیکھا۔ ڈھاکہ اور لاہور کے درمیان کیا کچھ نہیں ہے۔ ان میں تہذیبِ حجازی اور ثقافتِ ہندی کی بلندی و برنائی کا ہر عنوان موجود ہے۔ میر کی تمام کائنات دلی کے گلی کوچوں تک ہی محدود ہے مگر جذبہ واحساس کی زد میں کرۂ ارض ہے۔ غالب کی عظمتِ فکر کو تقریباً ہر ایک نے تسلیم کیا ہے انھیں دہلی اور کلکتہ سے آگے دیکھنے کا موقع میسر نہیں ہوا۔ مگر تصورات میں چاردانگِ عالم ہے۔ انھوں نے دہلی میں ہندوستانی سماج کو بہت دیکھا بھالا تھا مگر بنارس کی زیارت اور خاص طور پر دریائے گنگا میں پجاریوں کے اشنان کے منظر نے وجد کی جو کیفیت طاری کی اس کی مثال کلامِ غالب میں نہیں ملتی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمہ جاہائے بے تن کن تماشا
ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
سوادش پائے تختِ بت پرستاں
سراپا لیش زیارت گاہِ مستاں
قیامت قامتاں مژگاں درازاں

زمژگاں برصفِ دل نیزہ بازاں
بیاباں در بیاباں لالہ زارش
گلستاں در گلستاں نو بہارش

ہمارے عظیم مفکر شاعر اقبال نواحِ بنارس سے گزرے۔ مگر شہر میں قدم رنجہ رکھنے کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھی اپنی اوّلین فکری تخلیق میں شہر اور اہالیانِ شہر کو جو نذرانۂ احترام پیش کیا وہ ایک بے مثل تخلیق ہے۔ اسرارِ خودی کے اختتامی حصے میں ''حکایت شیخ و برہمن و مکالمۂ گنگا و ہمالہ'' کے عنوان سے ایک نظم ہے بنارس کے برہمن کی عظمتِ فکر و برگزیدگی علم کی ایسی توصیف بھی نظر سے نہیں گزری یعنی وہ وافر حکمت، ندرت کوش ذہن، ذہانت کی سربلندی، مہر و ماہ پر کمند ڈالنے والی حکمت کا مالک ہے:

در بنارس برہمندے محترم — سر فرود اندر یمِ بود و عدم
بہرۂ وافر ز حکمت داشتے — باخدا جویاں ارادت داشتے
ذہنِ او گیرا و ندرت کوش بود — باثریا عقلِ او ہم دوش بود
آسیانش صورتِ عنقا بلند — مہر و مہ برشعلۂ فکرش سپند

شیخ علی حزیں کو برہمن پسر سے ایک گونہ التفات ہے۔ غالب بھی قیامت قامتاں مژگاں درازاں سے رضا و رغبت رکھتے ہیں۔ اقبال کو بھی برہمنوں سے ایک خاص انسیت ہے۔ مذکورہ اشعار کا تعلق بنارس کے برہمنوں کی دانش و فکر سے ہے۔ کشمیر کے برہمنوں کا ایسا والہانہ ذکر بھی کہیں نہیں ملتا۔ زندہ دل برہمن زادوں کے روبرو لالۂ احمر بھی پشیماں ہوتا ہے:

آں برہمن زادگان زندہ دل
لالۂ احمر ز روئے شاں خجل

رشید صاحب کچھ دنوں ملازمت کے سلسلے میں بنارس میں رہے۔ ان کے خاکوں کی شبیہ سازی میں اس شہر کے معبدِ عام کے مجسّموں کے اثرات کی نشان دہی مشکل نہیں ہے۔

اسی شہر کے معبدِ عام کی دل کشی نے شیخ علی حزیں کو ایران واپس نہیں جانے دیا انھوں نے اپنی جانِ آفرین کو اسی خاک کے حوالے کیا۔ رشید احمد صدیقی کے معترضین اس نکتے کو دور از کار

سمجھتے ہیں کہ بنارس اور علی گڑھ کے بیچ دنیا کی چار اہم ترین عالمی تہذیبوں سے ان کا سابقہ پڑا اور انھوں نے اسلامی، عیسائی، ہندی اور بودھی عقائد اور افراد سے انسیت حاصل کی۔ جون پور کے پڑوس میں غازی پور ہے۔ یہاں نیل اور افیون کے کارخانے کمپنی بہادر کے زمانے سے قائم ہیں۔ ان کے انتظام وانصرام میں یورپی حکام پیش پیش ہیں۔ جون پور کے نواح میں قالین بانی کا کام عالمی شہرت رکھتا ہے۔ یورپ کے تجارتی منڈیوں تک پہنچانے اور ملکی برآمدات میں اضافہ واستحصال انگریزی عمل داری کا نصب العین تھا۔ ہاں بنارس کی ریشمی ساڑیوں سے انھیں کم دلچسپی تھی۔ مگر قریہ قریہ پھیلی ہوئی ان مذکورہ صنعتوں کی دست کاری نے نقش ونگار اور بیل بوٹے کی تخلیق کو مزاجِ عام میں پیوست کیا تھا۔ دوسری طرف حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے گلاب، چمیلی اور بیلے کی کاشت کا دل فریب منظر اور انھیں سرِ شام چن کر کھلے آسمان کے نیچے پھیلا کر شبنم سے بھگونے کا عمل بہت ہی کیف آگیں ہوتا۔ پھولوں کے یہ ڈھیر کھیتوں سے بستیوں تک لائے جاتے ہیں دریا میں دھلے ہوئے سفید تل میں تہ درتہ بسایا جاتا۔ بعدازاں مختلف اقسام کے روغن تیار کیے جاتے۔ اسے گھر گھر اور خانہ ساز کاروبار کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ ان گنت خوشبوؤں اور مسالوں کی مدد سے مختلف مجموعے بھی تیار کیے جاتے جن میں عطرِ مجموعہ بھی ہے اور عود وعنبر بھی۔ لطیف ترین کیفیات میں ملبوس اور اس فضا میں رشید صاحب کا پھولوں سے والہانہ عشق تلازمۂ طبیعت کا درجہ رکھتا ہے۔ رہائشی مکان کے پائیں باغ میں روش روش پر بہ رنگ اور خوشبوؤں سے بوجھل پھولوں کا قطار اندر قطار منظر گزرگاہِ خیال کو بھی جھک جھک کر نظر بازی کے آداب سکھاتا ہے۔ ان کے تصورات کی تطہیر، خیال کی تازگی، لفظ ومعنی کی رنگ برنگ مرئی وغیر مرئی تصویریں اور تمثال کی دنیا انھیں عناصر سے مرکب ہے۔ اجمالاً ان کی تحریر اور فن خونِ جگر کی وہ کشید ہے جس میں ان کی عمر بھر کا سوز وساز شامل ہے۔ اس سوز وگداز میں ان کے محسوسات کا اضطرابی عالم پوشیدہ ہے۔ وہ عمر بھر اسی پیچ وتاب کے شکار رہے۔ مگر پایانِ عمر کے ساتھ اس کرب میں شدت اور محسوسات کی دل دوز کیفیات نے گھر بنالیا اور یہی سرمایۂ حیات ٹھہرا:

> ''میری تمام پونجی وہ تاثرات ہیں جو کسی حادثہ پر ہی نہیں مسائل کے بارے میں براہِ راست محسوس کرتا ہوں۔''

وہ بہت ہی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ واقعات سے گہرا تاثر لیتے اور ان حادثات سے پیدا ہونے والے مہلک اثرات پر ان کی نظر رہتی اور وہ سرزد ہونے والے نتائج سے سراسیمہ رہتے۔ وہ کبھی بے نیاز نہیں رہے۔ حالات کے تغیر سے بے نیاز رہنے والوں پر انھوں نے طنز بھی کیا ہے اور تاسف بھی۔ اسی لیے وہ احتساب کی گرفت کو مضبوط رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بے حسی اور گریز پائی موجبِ ہلاکت ہے۔ یہ بے حسی خواہ بشر کی ہو یا پورے سماج کی۔ وہ تاثرات کی جس دنیا سے دوچار تھے اس میں دردوکرب کا اضافہ ہونا لازمی تھا۔ پیہم حادثات نے تشویش میں مزید شدت پیدا کی۔ وہ کم گو بھی تھے اور کم آمیز بھی۔ مگر ردِعمل میں احتجاج وملامت کا پہلو غالب ہوتا گیا۔ آہستہ آہستہ یہ لہجہ نفرت وحقارت کے اظہار کی طرف مائل ہونے لگا۔ احتجاج وحقارت میں پوشیدہ ان کے دلی دردوکرب کا نمایاں ہونا ان کی خلش کا پتہ دیتا ہے۔ اس اظہار میں بھی ان کی نمایاں انفرادیت قائم ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

> ''اردو کو محروم کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں، وہ ایسے ہیں جن پر کوئی مہذب حکومت فخر نہیں کر سکتی۔''
>
> ''خرابی کی جڑ دراصل یہ ہے کہ اردو کا حق مار کر اردو بولنے والوں کو ہندی سیکھنے پر مجبور کیا گیا اس لیے وہ ہندی کو جبر کی علامت سمجھتے ہیں۔''

''عزیزانِ ندوہ'' کے یہ جملے ان کے احتجاج کی شدت اور اس سچائی کو پیش کر رہے ہیں جس سے پورا اردو معاشرہ دوچار تھا اور حکومت کی اردو دشمن پالیسی کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اردو دشمنی کے خلاف باغیانہ لب ولہجہ سے بھرپور تحریر رشید صاحب کی اپنی شناخت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ رشید صاحب نے اردو کو جس طرح چاہا ہے بایدوشاید کسی نے اس طرح اظہار کیا ہو۔ ان کی فکر میں اردو صرف ایک زبان نہیں ہے بلکہ عالم گیر ثقافت کی ترجمان اور وسیلۂ ابلاغ ہے۔ پوری ایک قوم کے دل ودماغ کا شفاف آئینہ ہے بلکہ ان سب کے سوا بھی یہ کچھ اور ہے۔

> ''اردو زبان کے علاوہ بہت کچھ اور بھی ہے جیسے ایک قیمتی ورثہ ایک قابلِ قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک مسحور کن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا۔''
>
> (آشفتہ بیانی میری)

اردو سے ان کا تعلق بے سبب نہیں ہے۔ یہ برصغیر کی صرف ثقافتی زبان ہی نہیں ہے بلکہ سوادِ اعظم کے ذکر و فکر کی تمام واردات کی امین اور محافظ بھی ہے۔ مادری زبان کی عدم موجودگی میں قومیں گونگی ہو جاتی ہیں اظہار و ابلاغ سے قطعِ نظر فکری و جذباتی ترقیوں کی تمام راہیں مسدود ہو کر غلامی کی لعنتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں آزادی کے بعد یہ بات پوشیدہ نہیں رہی کہ اردو دشمنی کی تمام حکمتیں تہذیب کشی میں بدل گئی ہیں اور اردو معاشرہ کو تجدیدِ غلامی کے طوق پہنانے کی اجتماعی سازش رچی گئی جس سے ہم آج تک جاں بر نہ ہو سکے۔ ردِ عمل کی ایسی شدت کا اظہار رشید صاحب کے ہیجان اور حواس کی درماندگی کا اشارہ کرتا ہے۔

"ہماری تقدیر جہنم سے گزرتے رہنا ہے۔ جنت میں قیام نہیں یہ امت آزمائش کے لیے مبعوث ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سالہا سال سے کچھ اس طرح کا حال ہے جیسے کسی نے زندگی کے سارے ہرے بھرے درخت کاٹ کر گرا دیے ہوں اور ان میں آگ لگا دی ہو۔ آپ جانتے ہیں گیلی لکڑی کتنے ڈھیرے ڈھیرے، کتنے دنوں تک سلگتی رہتی ہے اور اس سے کیسا تاریک اور دم گھٹنے والا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔"

حیرت ہے کہ کم آمیزی اور خلوت نشینی کے باوجود وہ مصائب کو بہ رضا و رغبت انگیز کرنے کے لیے کبھی نہیں تیار ہوئے۔ عزم و حوصلہ اور بوقت ضرورت ایثار و شہادت کے لیے کارزار میں اترنے کی دعوت دیتے ہیں۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"اب تک ہندوستان دو عالم گیر جنگ کی براہِ راست ہلاکتوں سے محفوظ رہا تھا یہ کسے معلوم تھا کہ یہ کمی ۱۹۴۷ء میں وہ خود اپنے ہاں ایک خونی تقریب منا کر پوری کرے گا۔ اس کا اثر مسلم یونیورسٹی اور مسلمانانِ ہند پر جیسا کچھ پڑا وہ محتاج بیان نہیں۔"

ان کی اس دو نیم کیفیت کا احساس ہر صاحبِ صدق و یقین کو ہوگا جو ان کے قلبِ حزیں

کے قریب ہوگا۔ اردو یا اردو والوں سے کینت اور کدورت رکھنے والا بے حس ہی نہیں بد توفیق بھی ہوا کرتا ہے۔ یہ حشرات الارض کی طرح چاروں طرف شوروغوغا کے ساتھ پرچم اور پرچہ بازی کے کرتب دکھاتے پھرتے ہیں۔ اور پانی کی کثافت سے کیڑا، کیڑے سے بندر اور بندر سے انسان کی ترقی پسندی کے فسق وفساد کو نظم ونہادِ آئین سمجھتے ہیں۔

یہ اقتباس کسی خاص اہتمام یا احتیاط سے نہیں پیش کیے گئے ہیں بلکہ یہی ان کی کائناتِ فکر اور موضوعِ سخن ہے جس میں یہ تینوں زاویے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اردو، علی گڑھ اور مسلمان اور ان کے متعلقات پر ہی ان کی توجہ ہے اور یہی ان کا نصب العین ہے۔ ان تینوں مسائل پر ان کی تحریر اور توجہ کا مدار ہے۔ آزادی کے بعد انھیں کو نابود کرنے کے لیے اندرونی اور بیرونی طاقتیں درپہ آزار تھیں اور یہ سب کچھ رشید صاحب دیکھ رہے تھے۔ بھلا ایک حساس ادیب کیسے فراموش کرتا۔ بعض کوتاہ بیں حضرات نے رشید صاحب کے اس رویے کے خلاف بھی لکھا۔ ظاہر ہے کہ ان ناقدین کو نہ اردو سے ہمدردی تھی اور نہ ادارے سے اور نہ مسلمانانِ ہند سے بلکہ وہ خود فراموشی میں مبتلا تھے یا کیے گئے تھے۔ ان کے لیے پُرفریب تصورات وضع کیے گئے تھے اور وہ منفعت کی مقناطیسیت میں محصور تھے۔ جو بری طرح برہنہ بھی ہوئے اور خوار بھی۔ رشید صاحب کی ہمہ گیری میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ان کے ارشادات کی وقعت بڑھتی گئی۔ اکابرین وعمائدین ادیب وفنکار سبھی نے رشید صاحب کے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ ان کو اعتراف ہے کہ رشید صاحب نے حادثات کی وقوع پذیری پر جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ سماجی بصیرت کا سب سے مقدس عرفان ہے۔ جو تخلیق کار کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس آگہی سے عاری ادیب طفلِ تسلیوں کا آلۂ کار بن سکتا ہے، دیدۂ بینائے قوم نہیں۔ اس کے دعوے دھوکہ ہیں اور فن بے اثر۔ نام نہاد ادیبوں نے فن کی حرمت کو پامال کیا۔ عصرِ حاضر کی فنی روایتوں میں یہ سب سے المناک ادبی حادثہ ہے جس سے ادبی تاریخ شرمسار ہے۔

رشید صاحب کی انتقادی عبارتیں شاہد ہیں کہ انھوں نے فن کے تقدس کو ہمیشہ قدرِ اولیٰ کے طور پر تسلیم کیا۔ اس کی تحریم کے ساتھ کسی طرح کے تمسخر کو کبھی گوارا نہیں کیا۔ فن کی عظمت اور فن کار کے فرائض پر انھوں نے اکثر بیش بہا خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھیں نہ تو لایعنی فن پسند ہے اور

نہ مقاصدِ حیات سے خالی فن کار۔ فن اور فن کار کی برگزیدگی کے لیے ان کے اپنے معائر ہیں۔ جن میں پیغام، انبساط، صحت بخش جمالیات، ایمان ویقین، ثقافتی احساس، اقدار شرافت، انسانیت، صالح تفکر، عرفان ووجدان آگہی وبصیرت جیسے عناصر ضروری ہیں۔ گویا وہ اقدارِ عالیہ کا پاسبان اور صفاتِ حسنہ سے متصف ہوتا ہے۔ اسی سبب اس کا فن جاوداں اور لازوال ہوتا ہے۔ اصولِ نقد پر ان کی باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں ہے لیکن انھوں نے مضامین، مقالات، خطبات، تقریظ، خطوط اور گفتگو میں فن اور فن کار کے تعلق پر بڑی فکر انگیز گفتگو کی ہے جس سے ان کی ناقدانہ حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ انھوں نے پارۂ تخلیق کو پرکھنے کے لیے ایک انفرادی معیار قائم کیا ہے جسے ثقافتی انتقاد کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے تمام تنقیدی مباحث یہی اساس فراہم کرتے ہیں۔ فن تہذیب کے آغوش میں تخلیق پاتا ہے اقدار کی ترجمانی سے ابدیت حاصل کرتا ہے۔ وہ زمان ومکاں کی تسخیر اور رہِ حیات میں رہبری کرتا ہے۔

"شعر وادب اعلیٰ انسانوں کے اعلیٰ اور متحدہ سرگرمیوں کا نتیجہ ہے اس کو ادنیٰ یا مشتبہ مقاصد کے لیے زیروزبر نہ کرنا چاہیے۔ یہ سوسائٹی کے ساتھ غداری ہوگی جسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔"

"ادب وآرٹ میں کچھ ابدی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں جن کے بغیر نہ وہ مستند مانے جاتے ہیں نہ پروان چڑھتے ہیں اور نہ مفید ہوتے ہیں... یہ ابدی عناصر زماں ومکاں کے قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایثار، عفت، صداقت، مروت، شجاعت، قناعت وغیرہ پر جدید وقدیم کا اطلاق کب ہوا ہے؟"

ادب تہذیب کا اعلیٰ اظہار ہے۔ ثقافت سے ہی ادب مستنیر اور منزہ ہوتا ہے۔ تہذیب صالح اقدار کا مجموعہ ہے ادب کی تفہیم میں پیمانۂ اقدار کا پیشِ نظر ہونا انتقادیات کا اصل الاصول ہے یہ پیمانے نوعِ بشر کی اجتماعی مساعی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ایک فرد کی ذہنی اُپج سے نہیں انفرادی فکر سے جمالیاتی، نفسیاتی، اشتراکی وغیرہ وغیرہ قسم کے ان گنت اصول وضع کیے جاسکتے ہیں مگر ان سے فن کی کلّیت اور قدر وقیمت متعین نہیں کی جاسکتی کیونکہ ادب نہ ایک دن کی تخلیق ہے اور نہ ایک بشر کی انفرادی کوشش کا نتیجہ۔ تہذیب کو پنپنے اور سنورنے میں سیکڑوں ہزاروں سال درکار

ہوتے ہیں اور ایک فن پارے کی تخلیق میں ان گنت ماہ وسال کی بازگشت ہوتی ہے۔اسے کسی ایک فرد کے قائم کردہ اصول اپنی گرفت و گیر میں نہیں لا سکتے۔ہم نے دیکھا کہ بیسویں صدی اردو تنقید کا عہدِ گُل سے کم نہیں کیسے کیسے اور کتنے نظریات یا نظام قائم کیے گئے۔مگر کسی ایک کو ربع صدی کے لیے بھی استقرار نصیب نہ ہوا۔مستعار انتقادی دانش وبینش نت نئے تغیرات سے دوچار ہو کر ادبی معنویت کھو بیٹھے۔غیر فطری پودوں کی متخالف جغرافیائی آب و ہوا میں قلم کاری کیوں کر راس آسکتی ہے۔مغربی ادبیات کے میزانِ قدر مختلف ہیں۔دنیا کی دوسری ادبیات پر اسی کا اطلاق فعلِ عبث ہوگا۔ناقدین کی یہ بوالعجبی ایک اساطیری مہم جوئی تھی جو الیے پر ختم ہوگئی۔رشید صاحب نے تنقید کے ان پہلوؤں پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے:

> ''جب تنقید کی گرفت یا گرم بازاری زیادہ ہو جاتی ہے تو تصانیف بے جان نہیں تو نیم جان ضرور ہونے لگتی ہیں۔آج کل اردو تنقید کا دورہ پڑ رہا ہے۔جہاں جایئے یا جس سے ملئے یا تو نقاد ہوگا یا نیتا۔''
>
> ''مذہب اپنے تاریک سے تاریک زمانہ میں بھی اس حد تک مضحکہ خیز یا بلائے جان نہ رہا ہوگا۔جتنی تنقید آج بیسویں صدی کی وسط میں ہے۔سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات یا قوتِ مردمی کے سلسلے میں کوئی ایسا نظریہ دریافت نہ ہوا ہوگا جسے ہمارے نقادوں نے اردو شاعری وادب پر چسپاں نہ کیا ہو جو نظریہ جتنے زیادہ فساد یا فضیحتے کا ہوگا اتنی ہی شدت یا شوق سے اسے شعروادب پر چسپاں کریں گے۔''

کسی شہ پارے کی پرکھ میں یہ کلیہ کاملاً کامیاب ہو یا نہ ہو مگر رشید احمد صدیقی کے فن اور فکری پس منظر کی تفہیم میں ان کا ثقافتی سیاق اور سماجی ادراک ناگزیر ہے۔اسی منظرنامے کی بدولت ان کے فن کی دنیا روشن ہے۔اور ان کے سوزِ دروں کی تب وتاب جاوداں ہے جو کبھی طنز کی خلش اور مزاح کی مسکراہٹوں کے عقب سے جذبہ واحساس کو متاثر کرتی ہے اور کبھی فکری وانتقادی جملوں کی بے بہا بلاغت اور معانی کی جہات آفرینی ہمیں مرعوب ومغلوب کرتی ہے۔الفاظ کی تراشیدگی اور ترکیب سازی سے عبارت کے ساتھ ذہن بھی جگمگانے لگتا ہے۔روشنی کی فضا میں

وجد کا سماں قاری کو سرشاری وسرمستی کے ساتھ تدبر وتفکر کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ان کے فقرے اور جملے ہمیں سوچنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔شاید ہی کسی نثر نگار کی عبارت قاری سے غور وفکر کے لیے قول وقرار کا مطالبہ کرتی ہو کیوں کہ ان کی تحریروں میں ان کے جگر کا لہو رگِ سنگ کی طرح پوشیدہ ہے۔غالب کا یہ خیال ان کی فکر میں بڑی معنویت رکھتا ہے جسے انھوں نے تعظیم کے ساتھ اور محتاط طریقے پر قلم بند کیا ہے:

فرجامِ سخن گوئی غالب بتو گویم
خونِ جگر است از رگِ گفتار کشیدن

اسی خونِ جگر سے رشید صاحب نے اپنی نوا کی پرورش کی تھی۔یہی ان کے صریرِ خامہ کی سرنوشت ہے جو میراثِ رشید کے طور پر ان کے قارئین کے قسمت کی تحریر بھی قرار پائی۔کسے معلوم تھا کہ جنبشِ قلم سے لطف وانبساط کی دولتِ بیدار بانٹنے والا خوش فکر ادیب پایانِ کار ہمارے لیے شاخِ گل سے صلیب ودار کا سامانِ سفر بھی فراہم کرے گا۔

■

رشید و مرشد

موجۂ گل سے ماتمِ شہرِ آرزو تک

ادبی حوالوں میں معاصرین اورعزیزوں کی صلاحیتوں کے استقبال اور اعتراف کے متعدد واقعات درج ہیں۔ صحت و عدم صحت کی توثیق سے قطعِ نظر غالب کے بارے میں میر کا قول، یا مولانا فاروقی چریا کوٹی کا شبلی کے بارے میں 'انا اسد' وانت شبلی' کہنا ایک استقبال کی یاد دلاتا ہے۔ داغ دہلوی، پروفیسر آرنلڈ، مرزا ارشد گورگانی نے اقبال کو پیش گوئی سے نوازا۔ خود اقبال کی نظر کی داد دیجیے کہ ان کی تحریروں میں کچھ انسانوں کی بے پایاں صلاحیتوں کا اعتراف ملتا ہے اور ان کے خوش آئند مستقبل کی طرف واضح اشارے موجود ہیں، جب مردِ کار کی نگاہوں میں تقدیرِ عالم بے حجاب ہو تو انسان کیا کائنات میں سرزد ہونے والی سرگرمیاں شفاف آئینے کی طرح آشکار ہوتی ہیں۔ شیخ عبداللہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جوش ملیح آبادی اور رشید احمد صدیقی کے مستقبل کے مقدرات کی جھلک اقبال کے آئینہ خانے میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ وہی رشید احمد صدیقی ہیں جو فورِ شوق میں اقبال سے ملنے علی گڑھ سے لاہور گئے تھے اور اقبال کا اعتماد بھی قابلِ رشک ہے کہ بچوں کی تربیت کے لیے نگراں خاتون کی تلاش اور انتخاب کی ذمہ داری علامہ نے رشید صاحب کے سپرد کی تھی۔ بیسویں صدی کے نصفِ اول تک برصغیر کی اسلامی ثقافت میں سب سے محبوب شخصیت علامہ ہی کی تھی۔

رشید صاحب نے اقبال سے متعلق ہی لکھا ہے کہ انسانوں کی پرکھ کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اس کے مراسم اور معائر کن انسانوں سے استصواب کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی انشا پردازی

کے علاوہ اس دور کے سب سے اہم خاکہ نگار ہیں۔ جن میں شخصیت کی تہ درتہ جاذبیت، اعمال وافکار کی متنوع صورتوں کا ذکر، نجی تعلقات اوران کی ہمہ گیر نوعیت کا بے کم وکاست بیان انھیں زندۂ جاوید بناتا ہے۔ان کے خاکوں کے دونوں مجموعوں ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' میں جن موثر اور معتبر انسانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ عہد ساز ہیں۔ برصغیر کی مسلم ثقافت کے لافانی نقوش کی جلوہ گری کی جھلک ان بزرگوں کے اعمال وافکار سے بہت نمایاں ہیں۔ان میں بعض حضرات وہ ہیں جنھیں رشید صاحب نے جلوت وخلوت میں قریب سے دیکھا ہے۔بعض وہ بھی ہیں جنھیں دور سے ان کی خدمات کو اعترافِ نظر سے بہت قریب پایا ہے۔ذاکر صاحب پر انھوں نے جو کچھ قلم بند کیا ہے، اس کی نوعیت جداگانہ ہے۔انھیں سب سے زیادہ دیکھا ہی نہیں برتا بھی ہے۔ ذاکر صاحب پر رشید احمد صدیقی سے بہتر دید وباز دید کا دعویٰ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔تقریباً بتیس سال کی رفاقت نے جمالِ ہم نشیں کے ہر لمس کو محسوس کیا ہے، مزاج کی جملہ کیفیات سے واقفیت، نام ونسب سے نسبت، شب وروز کے حال ومقام سے بہرہ وری، کمزوریوں اور کوتاہیوں کی اداشناسی غرض ذاکر صاحب کی ذات وصفات سے اس قدر دلچسپی کسی اور کے مقدر میں نہیں آئی۔ اور پھر رشید صاحب نے علی گڑھ میں رہ کر برصغیر کے تمام سربراہوں کو اپنے پیمانۂ قدر پر پرکھا ہے۔ان کے مقدر کے ستاروں کے بننے اور بکھرنے کا نظر فریب منظر رشید صاحب کے عالمِ ادراک میں ہے:

ہمیں کیا دیکھتے ہو ہم نے اک عالم کو دیکھا ہے

یہ شخصی تعلقات کا ہی تاثر یا سحر تھا کہ رشید صاحب نے سب سے زیادہ اپنے ممدوح پر ہی لکھا۔پوری کتاب رقم کردی، کبھی مرشد کبھی ذاکر صاحب کبھی ''موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال'' کے عنوان سے اور پھر ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' مضامین سپرد قلم کر کے ذاکر صاحب کو جاوداں بنایا۔ ایک ادیب وانشا پرداز کے قلم کی روشنائی ہی شخصیتوں کو لافانی پیکروں میں ڈھالتی ہے۔ سنگ تراش کے مجسّمے، مصور کے موئے قلم کی رنگینی سب کو دست بردِ زمانہ دھندلا کر دیتا ہے۔ مگر شاعر وادیب کے حرف وصوت کی صدائیں گنبدِ آب گینہ رنگ میں دائمی حیات حاصل کرتی ہیں۔ موجودہ فکری درماندگی کو دیکھتے ہوئے اندیشہ بھی ہے اور امکان بھی

کہ تاریخ اس درِ نایاب کے تذکرے سے دانستہ گریز کرے چشمِ بصیرت محوِ حیرت ہے کہ پرانی کہاوتوں میں کاذبوں کو یادداشت سے محروم بتایا جاتا تھا۔ اب دانائی اور دانشوری کی ادعائیت کو حرزِ جاں رکھنے والے بھی محسنوں کی تکریم کجا ان کے کارناموں کو صفحۂ تحریر سے زائل کرنے پر تلے ہیں۔ اس سیاق میں رشید صاحب کی تحریریں ہی ان کی شخصیت کو جاوداں پیکر بنا کر نسلوں کی لوحِ تقدیر کو آگہی وانبساط کی راجمندی سے سرفراز کرتی رہیں گی کیوں کہ یہ صرف ادیب کی انشاپردازی ہی نہیں ہے بلکہ یہ جنوں گرفتہ گرمیٔ اخلاص ہے جس کی تپش اور تمازت سے زمکان ومکاں کے سیل تھم جاتے ہیں۔ فن کار کے ہنر مند ہاتھ سے ابدیت کی حامل تصویریں نمودِ پیہم بن جاتی ہیں۔ شیکسپیئر نے لکھا تھا کہ جب فولاد، کرۂ ارض اور بحرِ بے کراں کی ناپید کنار طاقتیں بے رحم فنا کی زد سے نہیں بچ سکتیں تو پھر اے دوست برگِ گل سے بھی لطیف تیرا حسن کیسے استقرار حاصل کرسکتا ہے؟ ہاں مگر صرف میرا قلم ہی تجھے زندگیِ جاوداں دے سکتا ہے۔

ایک عبارت ملاحظہ ہو:

> ’’ذاکر صاحب علی گڑھ آ گئے۔ لسان الغیب نے بشارت دی ’’یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور‘‘ عندلیبِ باغ حجاز کی دعا پہنچی۔ کلی کلی ہوتری گرمیٔ نوا سے گداز، اور محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب پھر ایک بار اپنی اس کھوئی ہوئی فردوس میں آباد ہیں، جس کو اقبال نے آغوشِ مادر کی کھوئی ہوئی فردوس سے بھی زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ یہ آنا علی گڑھ اور ذاکر صاحب کے درمیان ایک دیرینہ پیمانِ وفا کی تجدید، ایک نئی زندگی کا طلوع اور ایک نئے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم واعلان تھا۔ شکستہ ودل گرفتہ اور پابستہ مرغانِ چمن فرطِ مسرت سے زمزمہ سنج ہو گئے۔ سلام علیٰ نجد دھل من نجدا۔‘‘

ذاکر صاحب کو مختلف مناصب اور مقام پر آمد ورفت کے وقت بہت سے سپاس نامے اور استقبالیے پیش کیے گئے ہوں گے، جن میں حرص وہوا کو بھی دخل ہوگا، خوش آمدید ومصلحت کو بھی۔ مگر وہ سب اس کیف وکمال سے خالی ہیں۔

میں خاکہ نگاری کے ارکان یا استشہاد پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ عرض ہے کہ مزاج شناسی

یا طبائع کی باز آفرینی انسانی مشاہدہ و ادراک کا سب سے پیچیدہ عمل ہے۔ عمر بھر کی ہم نشینی، علم و دانش کی یاوری اور نفسیات کی دروں بینی کے باوجود شخصیت کا مطالعہ زیادہ تر موہوم ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس مہم میں رشید صاحب کو جو مہارت حاصل ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔ شاید اسی لیے ممدوحین کی تصویریں زندہ، متحرک اور توانا بن گئی ہیں۔ ذاکر صاحب میں فطرت کی بخشی ہوئی بہت سی نعمتیں جمع ہو گئی ہیں۔ جلال و جبروت اور قوت و شوکت سے جمال و زیبائی اور حسن و لطافت ہم آمیز ہیں۔ ان کی سرشت میں قاہری اور دلبری کا ارتباط تمثال کی صورت رکھتا ہے۔ عناصر کی یہ ترتیب و تہذیب رشید صاحب کے لیے بڑی دلکشی رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے مخدوم اقبال کے مردِ کامل کی یہی پہچان ہے۔ اس کی ایک جھلک ذاکر صاحب کی ذات میں ملتی ہے:

> ''ان کی تقریر نہ خطابت ہوتی تھی نہ موعظت، لیکن خطابت کا زور اور گرمی اور موعظت کی رحمت و شائستگی بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ الفاظ و عبارت میں صفائی، خیالات میں رفعت اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب تقریر کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آتی ہے۔ پہاڑ ہی کا اوج، وزن و وقار، ان کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنے سیل سفر کی ہر منزل پر شفاف، شادماں و شگرف کار رہتا ہے۔''

ایک اور جملہ پیشِ خاطر ہے:

> ''ذاکر صاحب کی شرافت، وسعتِ قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

> ''ایک متنفس بھی ایسا نہیں جس نے ذاکر صاحب کی معاملہ فہمی، خلوص اور قطعاً بے لوث ہونے کا اعتراف نہ کیا ہو۔''

سیرت و شخصیت کا یہ ادراک عام نہیں ہے۔ اس کے لیے بے خوف و خطر مراسم کی ماہیت سے بے گانہ ہو کر اندرونِ وجود میں اترنا پڑتا ہے۔

رشید صاحب نے جگہ جگہ ان کی شخصیت کو اقبال کے تصورات سے قریب تر پایا ہے اور حسنِ بیان میں اشعار سے مرشد کی شبیہ کو سنوارا ہے۔ انھوں نے اقبال سے استفسار کیا تھا مردِ مومن

کے وجوب کی نوعیت کیا اور کہاں کہاں ہوسکتی ہے؟ اس کی ایک جھلک انھیں اپنے مرشد (ذاکر حسین) میں نظر آتی ہے:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
نگاہ جس کی ہو بے داغ ضرب ہو کاری

ذاکر صاحب نے بدلتے ہوئے حالات کو جس طرح خوش آمدید کہا یا بادلِ ناخواستہ قبول کیا وہ ان کے گذشتہ عزائم کے منافی تھا۔ رشید صاحب کسی سمجھوتے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ ذاکر صاحب کی بہار کی گورنری پر وہ بہت برہم تھے۔ ان کی افسردگی میں اضافہ ہوتا گیا اور پایانِ عمر کی تحریریں ان کے طنز و مزاح سے یکسر تبدیل ہوگئیں۔ رشید صاحب کی مسلم مسائل سے دلچسپی بڑھتی گئی ذاکر صاحب سے توقعات کی عدم تکمیل کے باعث قربت کی وہ کیفیت کم ہوگئی جوان کو اپنے مرشد سے ابتدا میں تھی۔

رشید صاحب نے بھی ذکرِ ذاکر کو ایک علامت سے متشابہ کیا ہے۔ ان کے کردار و گفتار یا حرکات و سکنات کی وسعت طلبی اور احاطہ گیری میں ملت کے جوانوں جفاکشوں اور جویانِ ضمیر کے بہت سے اسرار پنہاں ہیں۔ ذکر ایک فرد کا نہیں ہے فردائے قوم کا ہے۔

> ''زندگی کی خوشی اس میں نہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے، خوشی اس میں ہے کہ ہم کتنوں کے رنج و راحت میں اور کتنے ہمارے رنج و راحت میں شریک رہے۔ اسی کو عزت و محبت کی زندگی کہتے ہیں، جو صرف انسان کو نصیب ہے۔ زندگی منزل بہ منزل اسی راستے اور روشنی میں ترقی و تہذیب کی اس بلندی تک پہنچتی ہے، جس سے آج ہم سرفراز بھی ہیں سرگراں بھی۔ زندگی کا یہ کارواں کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچتا ہے، اس کا اندازہ ان اچھے اور بڑے لوگوں کی دل سوزی، دانش مندی اور دلیری کی خدمات سے کیا جاسکتا ہے، جنھوں نے ہر خطرہ کا سامنا کیا۔''

ایسے ہی افراد بینائے قوم کہلاتے ہیں۔ یہ بصارتوں کے قندیلِ رہبانی اور بصیرتوں کے مخزنِ انوار سے متصف ہوتے ہیں۔ ان کی کارگہِ فکر میں قوموں کے روز و شب کی میقات متعین

ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں ہیرو پرستی کے اوصاف نہیں ہیں۔ ہم سایہ اور ہم سبق کے پیکر کی پیش کش ہے، جسے زندگی کی تیز گامی میں سبقت حاصل ہے۔ یہاں رشک و رقابت کو راہ نہیں ہے۔ رشید صاحب کی بصیرت کو آفریں ہے کہ انھوں نے ذاکر صاحب کے احوال کو اپنی فکر کے شفاف آبگینے میں اس طرح دیکھ لیا تھا، جس طرح حافظ اپنے پیالے میں عکسِ رخِ یار کا مشاہدۂ جمال کیا کرتے تھے:

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم

یہ پیالہ جامِ جہاں نما یا جامِ سفال سے الگ آئینۂ ملت کا قائم مقام اور مرکزِ ادراک تھا۔ مصدرِ اختیار کے ہاتھوں اس کی شکستگی رشید صاحب کے لیے روح فرسا اور زہرہ گداز تھی اپنی مشرقیت کے باعث ترکِ تعلقات اور برملا اظہار کے لیے جرأتِ جنوں کی ہمت نہ کر سکے۔ اندر اندر کڑھتے اور ٹوٹتے رہے۔ جسم و جاں کا اضطراب بڑھتا رہا۔ تنہا نشینی کم آمیزی اور جملہ معاملات سے بیزاری میں اضافہ ہوتا رہا۔ تحریروں میں قافلہ ہائے جنوں کے سالاروں کے اسبابِ سفر کے لٹنے کی رثا خوانی کا عنصر بہت نمایاں ہونے لگا۔ طنز و مزاح کے پیکرِ تخلیق کا سراپائے ماتمِ آرزو میں منقلب ہو جانا ہماری حکایاتِ زیست کا سب سے المناک حادثہ ہے۔ ان آزمائشوں کو مقدور بھر انگیز کرنے کے لیے ہی شاید ہم مبعوث کیے گئے ہیں۔ یہ رشید مرشد پر ہی موقوف نہیں ہے۔ وجودِ کائنات کے اعتراف کے بعد ہر فرد اور ہر بشر کی گزرگاہ یہی تیغِ جگر سوز ہے، جہاں عافیت ممنوع اور امتحان و ابتلا کو ملزوم ٹھہرایا گیا ہے تاکہ صدق و صفا اور کذب و قبح کے مابین امتیاز ہو سکے۔ اقبال کے بُعد رشید صاحب کی تحریریں اس صدی کی نصفِ ثانی کے محسوسات کی خوں چکاں داستان بیان کرتی ہیں۔ ان کی انگلیاں فگار ہوئیں یا نہیں لیکن وہ ہماری جراحتوں کے چراغ ضرور روشن کر گئے۔

■

رشید احمد صدیقی کی مکتوب نگاری

رشید صاحب کی تحریر ذکر وفکر کے سرمایہ سے معمور ہے۔ دوسرے اصناف اور مباحث سے قطعِ نظر خطوط کی نوعیت اور جہات پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان موضوعات میں جو کثرت آرائی ہے وہ ان کی تحریروں میں کمیاب ہے۔ بعض وہ موضوعات جو ان کی دہلیز پر دستک نہ دے سکے انھیں خطوط کے توسط سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ عام طور پر خطوط کو عشق و عاشقی کے اظہار کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اگر چہ ایسا بھی رہا ہے۔ مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ خطوط میں مذہبی، سیاسی، سماجی، معلوماتی، افسانوی، تنقیدی، تحقیقی، فکری، سائنسی غرض سبھی موضوعات کی گنجائش ہے۔ اردو کے مکتوباتی ادب پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان میں جو تنوع ہے وہ دوسری جگہ نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط دعوتی ہیں۔ یہ رشد و ہدایت کے پیغام کو پیشِ نظر کرتے ہیں۔ یہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ ہیں جو مختلف ملکوں کے سربراہوں اور وہاں کے عوام کے نام یہ ارشادات ایک دعوتی پیغام کے طور پر لکھے گئے۔ اور یہی حال ان کے خلفاء کا بھی ہے۔ ان کے مکاتیب دعوتی بھی ہیں اور انتظامی بھی۔ خاص طور پر جناب فاروقِ اعظمؓ کے خطوط مختلف اسلامی ملکوں کے اعلیٰ منتظمین کے نام ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے خطوط کا ایک بڑا حصہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ عبدالحق محدث دہلوی کا تشریحِ دین پر مشتمل ہے۔ شیخ احمد سرہندیؒ کے خطوط نظریاتی یا فلسفیانہ تصورات کے حامل ہیں۔ غالب کے خطوط نجی ہیں جن میں ان کی زندگی کے شب و روز کے علاوہ فکرِ سخن، اشاعتِ کلام، احوالِ دوستاں، شہر کی حالت وغیرہ موضوعات حاوی ہیں۔ مہدی

افادی کے خطوط نجی ہیں۔شبلی کے خطوط نجی اور ذاتی ہونے کے علاوہ علمی مباحث پر بھی مبنی ہیں۔ مجنوں گورکھ پوری کے خطوط تنقیدی اور ادبی ہیں۔جنھیں مقالاتی بھی کہہ سکتے ہیں۔جیسے کہ مولانا آزاد کے خطوط نجی کم مقالاتی یا علمی زیادہ ہیں۔ان میں انشایئے بھی ہیں اور علمی اور معلوماتی بھی ہیں۔رشید احمد صدیقی کے خطوط سرتاپا ذاتی ہیں کہیں کہیں عصری اور معاصر شخصیتوں پر بھی پرسوز اظہار ہوا ہے۔اقبال کے خطوط کی نوعیت ان سے جداگانہ ہے۔ان کے عنوانات مختلف ہیں یعنی مضامین کے اعتبار سے یہ کئی عنوانات کے حامل ہیں۔اس تذکرے سے بتانا مقصود ہے کہ خطوط نگاری صرف ایک ادبی شناخت یا صنف نہیں ہے بلکہ ادب کا لازمی حصہ ہے جس میں موضوعات کا تنوع اور اس کا رنگ روپ بڑی کشش رکھتا ہے۔یوں بھی دیکھا جائے تو ہر شخص ادیب و دانش ور نہیں ہوتا۔مگر خط لکھنا ایک ضرورت ہے۔اگر وہ پڑھا لکھا ہے۔گویا خواندگی کے بعد خطوط لکھنا انسانی فطرت کا خاصا ہے۔یا اس کی شخصیت میں پوشیدہ اندرونی خواہشات کے اظہار کا وہ اضطراب ہے جسے کبھی تخلیقی کرب کہا گیا اور کبھی اظہار ذات یا خودنمائی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ان سب کے پیچھے داستان سرائی کی ایک فطرت خواہش کارفرما ہے۔جو لکھنے کے لیے مجبور کرتی رہتی ہے۔اسی کو شعری زبان میں کہا گیا ہے کہ ہم لکھتے رہیں گے خواہ خط کا مضمون کچھ بھی نہ ہو۔دوسرے لفظوں میں خط کا لکھنا انسانی نفسیات کی ایک جبلی خواہش ہے جس کی تکمیل اسکی شخصیت کی بھرپور ترجمانی ہے۔یہی نہیں انسان دوسروں کی دیگر تحریروں سے وہ دلچسپی نہیں رکھتا جو خطوط سے ہے۔دوسروں کے نام لکھے گئے خطوط کو پڑھنے کی خواہش بھی بڑے سے بڑے انسان کی کمزوری ہے۔اسی لیے اسے اخلاقیات میں ایک ناپسندیدہ عمل کہا گیا ہے اور جرم بھی قرار دیا گیا ہے مگر اس کے برعکس انسان کی فطری نفسیات کا یہ عمل بھی انتہائی پیچیدہ ہے کہ وہ غیروں کے خطوط اور اس کی عبارت جاننے کے لیے بے چین رہتا ہے۔اسی لیے خطوں کا سرقہ بھی ہوتا ہے اور یہ خرد برد بھی کیے جاتے ہیں۔اور ہمارے دور میں تو ان سے مخبری کا بھی کام لیا جاتا ہے۔شاید اسی لیے خطوط نگاری کے آداب میں ملفوف بھیجنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔کھلا خط لکھنا غیر مستحسن قرار دیا گیا ہے۔اور اہتمام کیا گیا کہ القاب وآداب کے ساتھ لکھا جائے۔اور حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے۔پتہ درست ہو۔نامہ بر معتبر ہو۔ان سب کے باوجود گم ہونے کے اندیشے لاحق رہتے ہیں۔لہٰذا نقلیں بھی

محفوظ کی جائیں۔اوروقت ضرورت ان کے حوالے دیے جائیں۔ڈاک خانے کے سپرد کیے جائیں تو ان سے بھی وصولیابی کی رسید محفوظ کی جائے۔غرض طرح طرح کے اہتمام کیے گئے جو خطوط کے ذیل میں ضروری سمجھے گئے۔ان سب کے بعد ان خطوط کا جمع کیا جانا ایک دوسرا مرحلہ ہے جو انسانی نفسیات کا ایک دوسرا پہلو پیش کرتا ہے۔یہ تقریباً ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ عزیز و احباب، اکابر و بزرگ کے خطوط جمع کیے جائیں اور انھیں محفوظ رکھا جائے۔اگر یہ جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو آج خطوط کا بڑا ذخیرہ ہماری دستیابی سے باہر ہوتا۔اور ہم بڑے خسارے میں ہوتے خطوط کا اتنا بڑا سرمایہ ہماری تہذیبی یافت کا ایک انمول خزانہ ہے۔یہ اسی انسانی خواہش کے نتیجے میں جمع ہوسکا ہے جو بزرگوں یا اپنے محبوب اشخاص کی ہر سطر کو تبرک کے طور پر محفوظ رکھنے کو بڑی سعادت سمجھتا ہے اس جمع و حاصل کی خواہش نے ہی خطوط کی حفاظت کی ورنہ غیر مرتب اور رقعوں پر بکھری ہوئی تحریر تو بہت جلد ضائع ہوجاتی ہے۔کتابیں تو بہ سہولت محفوظ کی جاسکتی ہیں مگر پرزوں پر لکھی ہوئی تحریر کی حفاظت آسان نہیں ہوتی۔اسی لیے اسلاف کی ان کاوشوں پر ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ایک بڑی تہذیبی وراثت کو ہمارے لیے محفوظ کردیا۔یہی نہیں بلکہ انھوں نے خطوط جمع کرنے کی ترغیب دلائی جو معاشرے کا مزاج بن گیا۔اور ہمیں یہ تحریک یا توفیق انھیں سے ملی کہ خطوط کو ضائع نہ کیا جائے بلکہ محفوظ رکھا جائے اور انھیں یادِ رفتگاں کے لیے مطالعہ میں بھی شامل کیا جائے۔

اس امر پر اختلاف رہا ہے کہ خطوط شائع ہوں یا نہ ہوں۔بعض اخلاقی وجوہ سے ان کی اشاعت کو معیوب سمجھا گیا اور اشاعت کی ہمت افزائی نہ ہوسکی۔کیوں کہ یہ ذاتی نوعیت کی تحریریں ہوتی ہیں جن میں لکھنے والا دوسرے اشخاص کے بارے میں بھی اظہار رائے کرتا ہے۔اور نجی زندگی کے دوسرے پہلو بھی اس میں در آتے ہیں۔اس لیے ان کی اشاعت مناسب نہیں ہے۔مگر دوسری رائے بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے کہ جو نجی ہیں یا ایسے خطوط جن سے کسی کی شخصیت پر کوئی ناخوش گوار اثر پڑنے کا اندیشہ نہیں ہے ان کی اشاعت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ان کے علاوہ جو علمی، معلوماتی، فلسفیانہ، ادبی اور مذہبی ہیں ان کی اشاعت سے ایک عام استفادہ کی راہیں پیدا ہوں گی اور عوام متعارف ہوں گے لہٰذا ان خطوط کی اشاعت لازمی قرار دی گئی جس کی وجہ سے آج خطوط کا ایک قابلِ رشک سرمایۂ ادب ہماری دسترس میں ہے اور ہم ان پر سیر حاصل تبصرہ اور تجزیہ

کر کے لائحۂ عمل مرتب کرتے ہیں۔ ان مکتوب نگاروں کے اندرونِ وجود کے خدوخال سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ نیز اپنی اصلاح و درستگی کا بھی وسیلہ فراہم کرتے ہیں۔ لکھنے کے آداب سیکھتے ہیں اور بچوں کو تلقین کرتے ہیں بزرگوں کی تحسین کرتے ہیں جنھوں نے اپنی شناخت سیرت وشخصیت کا بھرپور عکس ان تحریروں میں پیش کیا ہے۔ گویا خطوط نگاری ثقافت کا ایسا قابلِ رشک سرمایہ ہے جو تہذیبی عنصر کے طور پر تلازمۂ حیاتِ انسانی کا حصہ بن چکا ہے اور کسی بھی قیمت پر اس ادب یا سرمایہ سے مفر نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی کا خوش گوار عکس اس صنفِ ادب میں اظہار کی سربلندی رکھتا ہے جو شاید دوسرے اصناف کو حاصل نہیں ہے۔ انھیں وجوہات سے رشید صاحب کے خطوط کی جمع و تدوین پر توجہ دی گئی ہے۔ نگاہ اگر شریکِ بینائی ہو تو اس حیرت فزائی کو مکتوب نگاری کا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ رشید صاحب کے عاشقِ صادق کی محویت دیکھئے کہ پروفیسر لطیف الزماں خاں (ملتان) نے ان کے خطوط کو سات جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ دوسری طرف رشید صاحب کی تحریروں کے اکیس مجموعہ بھی ان کی بے پناہ محبت کے مظہر ہیں۔ رشید صاحب کی ہر تحریر کو میراثِ خلیل جان کر اس کی نگہبانی کی جا رہی ہے۔ منصوبہ بند طور پر بھی یہ کام انجام دیا جا رہا ہے۔ خطوط کے مطالعے سے قبل مکتوب نگاری سے متعلق ان کے یہ اقوال ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے:

> ''خطوط کو نہ پکا گانا ہونا چاہیے اور نہ فلمی قوالی۔ خط لکھنا دراصل خطبہ تصنیف کرنے کا فن نہیں جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنا گفتگو کرنے کا نہیں خاموش رہنے کا بھی فن ہے اس اعتبار سے یہ بڑا سخت گیر فن ہے اور صفاتِ عالیہ میں سے ہے اپنے بے پایان اور بے کراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا خدا کے ہی بس کی بات ہے۔''

شبلی و حالی کے بعد اسالیبِ نثر کو آبرو بخشنے اور نئے امکانات کو روشناس کرنے میں رشید احمد صدیقی کی خدمات کا ہم کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ شعری مقبولیت کی عام فضا میں نثر سے التفات اور احترام میں اضافہ کرنے والوں میں رشید احمد صدیقی بہت ہی نمایاں کردار رکھتے ہیں۔ نثر نگاری میں اسالیب اور آہنگ کے نام و نسب کا سلسلہ یا شجرہ ساخت کرنے کے لیے

انھیں یاد کیا جاتا رہے گا۔ طنز وتنقید کی معاصر تحریروں میں ان کے امتیازات کی نشان دہی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ طنز ومزاح ہو یا تنقید وتبصرہ، خاکے ہوں یا خطوط اور خطبات، ان کا انفرادی اسلوب کا نقش ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کے نثری جملے جس طرح ضرب المثل بنے ہیں وہ بے مثال ادبی وظیفۂ روز وشب سے کم نہیں۔ ان کی جاں سوزی اور دردمندی نے ان کی تحریروں کو جو دل گدازی بخشی ہے وہ ان کے موئے قلم کا معجزہ ہے جو صرف لفظوں کی خارہ تراشی کے طفیل نہیں ہے۔ یہ سخن اور ثقافت کا گداز ہے جو اپنے لہو کی آگ میں جل کر سنگِ خارہ کو موم بناتا ہے اور نشاطِ کار سے بے نیاز ہوتا ہے۔ بلکہ جینے اور جاں بازی کے لیے سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ عالم نے ان کی موجودگی محسوس کی یا نہیں لیکن رشید احمد صدیقی نے کئی عالم دیکھے تھے۔ ایک تقسیمِ ملک سے پہلے اور دوسرا طلوعِ صبحِ آزادی کے بعد۔ اس دونیم کیفیت سے ان کا سینہ شق تھا اور شخصیت لٹے ہوئے قافلے کی باقیات کی طرح بکھر کر رہ گئی تھی۔ قلبِ حزیں کی یہ کہانی ان کی تحریر میں صاحب ساز کا لہو بن کر ہر رگِ ساز سے رواں ہے۔ اس درد وداغ کے ذکر میں معاصر ادیبوں میں کوئی ان کا حریف نہیں ہے۔ سوز وساز کی یہی خلش ان کے طنز ومزاح کو تاثیر کی لذت سے معمور کرتی ہے۔ ان کی دوسری تحریریں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ خطوط خالی وقت اور نہاں خانے میں پڑھے جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ 'غبارِ خاطر' کی طرح وہ مقالے یا انشائیے نہیں ہوتے۔ یا 'پردیسی کے خطوط' کی مانند تنقید کی جدلیات کے اظہار کے لیے بھی نہیں ہوتے۔ متکلم اور مخاطب کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا۔ رفیق روبرو ہوتا ہے اور رقیب روسیاہ کوسوں دور۔ گویا خطوط کے خلوت خانے میں گزرگاہِ خیال کو بھی دخل نہیں ہوتا۔ من وتو کا منظر دو بدو ہو تو ذکرِ مدعی موقوف ہو جاتا ہے۔ بغضِ دماغ وکینہ وری کی فرصت کہاں؟ 'جاں زتن بردند' کے بعد فریدالدین عطار کی کیفیت ہوتی ہے:

اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں

اقبال کی طرح رشید احمد صدیقی خطوط کی اشاعت کے نہ قائل تھے اور نہ ہی زبانِ غیر سے شرحِ آرزو کے متمنی۔ وہ اسے بداخلاقی سمجھتے رہے۔ مگر طرفہ تماشہ دیکھئے کہ دونوں کے خطوط کے کئی مجموعے مرتب ہوئے۔ ان دونوں میں ایک اور اشتراکِ اخلاق ہے۔ اتنی مصروفیات اور

زندگی کی ہماہمی کے باوجود اردو کیا دوسری زبانوں میں بھی ایک ادیب نے اتنے خطوط شاید ہی لکھے ہوں۔ علامہ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ بیش وکم کے ساتھ یہی کیفیت خطوطِ رشید کی بھی ہے۔ پیشِ نظر تقریباً سو غیر مطبوعہ خطوط ہیں۔ ان میں زیادہ تر چھوٹے بھائی نیاز احمد صدیقی کے نام ہیں۔ جو بالکل ذاتی اور گھریلو معاملات پر مبنی ہیں دوسرے مکتوب الیہ سید آل حسن زیدی ہیں جو محکمۂ جنگلات دہرہ دون میں آفیسر تھے۔ نیاز احمد صدیقی محمد حسن انٹر کالج، جون پور کے پرنسپل تھے۔ سبک دوشی کے بعد وہ ندوہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ راقم نے پوری زندگی میں ایسا شریف النفس انسان نہیں دیکھا۔ رشید صاحب میل ملاقات سے گھبراتے اور کتراتے بھی تھے جبکہ ملنا جلنا نیاز صاحب کے روز و شب کا معمول تھا۔ جون پور سے جائے قیام منڈیاہوں تک بس سے سفر کرنے میں شناساؤں اور مسافرین سے وہ صرف مانوس ہی نہ تھے بلکہ پندرہ میل کی روزانہ کی مسافت نے انھیں روشناسِ خلق بنا دیا تھا۔ ان کے نام لکھے گئے خطوط میں ذاتی کوائف کے علاوہ ملک وملل کے مسائل کا بھی کہیں کہیں ذکر آ گیا ہے۔ ان کی علالت، بال بچے، عزیز واقارب کے ساتھ دوستوں اور بہی خواہوں کے بارے میں بھی تاثرات قلم بند ہو گئے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوا ہے لیکن کہیں کہیں ان کا ادبی اسلوب شعری حوالوں سے آراستہ ہو کر ان نجی خطوط کو شاہ کار تحریر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ان کے ممدوح ڈاکٹر ذاکر حسین پر بعض مذہبی حلقوں نے تنقید کی اور تنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے نیاز صاحب کے نام ایک خط میں لکھا کہ ایسے لوگوں کے بارے میں غالب کا یہ مصرع حرفِ آخر ہے:

ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سر نوشت کو

نثری عبارت میں مصرعوں، ترکیبوں اور ٹکڑوں کو خوب صورتی کے ساتھ استعمال کرنا ان کے اسلوبِ بیان کی منفرد پہچان ہے۔ ادبی حوالوں سے آشنا زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی تحریر کا حسنِ بیان شعری سیاق سے فیضان حاصل کرتا ہے جس سے ادبی شان وشکوہ پیدا ہوتا ہے۔ سید آل حسن زیدی علم نباتات کے اداشناس ہیں۔ ان کے نام خطوط میں دعا سلام کے علاوہ سب سے زیادہ ذکر پھولوں اور پودوں کا ہے۔ یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ رشید

صاحب کو مخصوص پھولوں سے عشق تھا۔ ان خطوط میں دو پھولوں کی کثرت سے فرمائش ہے۔ جیرنیم (Geranium) اور جربیرے (Gerbera) ایک جگہ ڈیلیا کا بھی ذکر ہے۔ پھول پودوں کے تذکرے میں شعر کے حوالے کا جواز پیدا کر لینا رشید صاحب کا وصفِ خاص ہے۔ برمحل ہی نہیں بھرپور شعری بلاغت اور معنویت کو جملوں میں ضم کرنا بڑی مہارت چاہتا ہے۔ ورنہ یہ ہنر عیوبِ برہنگی بن جاتا ہے۔ یکم نومبر ۱۹۷۱ء کے خط میں لطیف طنز کے ساتھ شعر کی حسن آفرینی نثر میں منتقل ہوگئی ہے۔

''اور یہ پودے آپ نے جس زحمت اور زبرزیر سے میرے لیے فراہم کیے ہیں ان کے لیے دل سے سپاس گزار ہوں۔ یہ تحفہ تو آپ کے لیے سالانہ تاوان بن گیا ہے! جربیرے کے لیے آپ نے جس پرہیز کی تاکید کی ہے، وہ پہلے سے مجھے معلوم تھی۔ پودے ہی نہیں جہاں پانی مرے گا وہاں خرابی آئے گی۔ مکرجی صاحب کو میرا بہت بہت غائبانہ شکریہ پہنچایئے۔ ان کے باغ کا چراغ میرے باغ کو روشن کرے۔ ایسا ہی ہے جیسے فارسی کے مشہور شاعر غنی کاشمیری نے کہا ہے۔ غنی، پیرِ کنعاں کے روزِ سیاہ کو تو دیکھو کہ ان کا نورِ عین زلیخا کی آنکھ کو روشن کرتا ہے!!''

ذاتی خط کا یہ اقتباس رشید صاحب کے اسلوبِ نگارش کا بھرپور ترجمان ہے۔ ہم آواز الفاظ کا اجتماع ہے اور طنز بھی ہے۔ شعر کا بروقت اور بے محابہ استعمال اور بھرپور ترجمہ لطف سے خالی نہیں ہے۔ تلمیح نے معنی کی دل کشی بڑھا دی ہے۔ طاہر غنی کاشمیری کے شعری متن:

غنی روزِ سیاہِ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

کی جگہ ترجمے میں حکمت بھی شامل ہے اور ماہرِ نباتات کو دل نشیں بھی کرانا مقصود ہے۔

انھیں وجوہات سے کسی ادیب یا دانشور کی ہر تحریر کی قدر و قیمت تسلیم کی جاتی ہے۔ کہیں نہ کہیں اسلوب یا افکار کا کوئی نہ کوئی پہلو افادیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی روشن مثال خطوط اقبال ہیں۔ ان کے افکار و اشعار کی شرح و توضیح میں مکاتیب بڑے معاون ہیں۔ فکر و نظر کے کئی نکات

ایسے ہیں جو صرف خطوط میں ملتے ہیں اور وہ شعری تخلیق میں ناپید ہیں۔ رشید صاحب کے ان غیر مطبوعہ خطوط میں کچھ زاویے ایسے ہیں جو اس صراحت سے کہیں اور نہیں ملتے۔ ہم گلابوں سے ان کی پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ مگر ان مکاتیب سے جربیرے اور جیرینیم سے ان کا تعلقِ خاطر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رشید صاحب کی مشرقیت مشہور ہے۔ ان کی وابستگی جنون و جاں سپاری سے بھی دو قدم آگے ہے۔ ان پھولوں اور پودوں سے والہانہ تعلق بتاتا ہے کہ وہ مغرب سے اتنے بیزار نہیں جتنا تصور کیا جاتا ہے۔ زیدی صاحب کے نام ایک خط مورخہ ۲۳؍اکتوبر۱۹۷۲ء کا آغاز اس مصرع سے ہوتا ہے:

"رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے"

یکم جنوری ۱۹۷۱ء کے مکتوب میں ان کے اسلوب کی پوری جلوہ گری نمایاں ہے:

"محبی، تسلیم۔ نوازش نامہ ملا۔ افسوس ضرور ہے کہ میری فرمائش پر آپ نے گذشتہ اکتوبر میں کسی صاحب کی معرفت جربیرے بھیجے لیکن مجھے مل نہ سکے۔ آپ کو ثواب ملا اور میں شکر گزار ہوا۔ خدا اور اس کے بندے دونوں کی طرف سے اس کی تلافی ہوگئی۔ سودا برا نہیں رہا نوروز کی تہنیت قبول فرمائیے۔"

نیاز صاحب کے نام تقریباً تمام خطوط خانگی ہیں۔ خاندان کے متعلقین اور معاملات ہی زیرِ بحث ہیں۔ بھائی، بہن، بھتیجے، بھانجے، بیٹے، بیٹی، داماد وغیرہ کی خیریت وسلامتی یا ان کی بہبود کے تعلق سے رشید صاحب کی فکرمندی نمایاں ہے۔ نیاز احمد، فصیح احمد، مطیع احمد، کمال احمد، اقبال احمد، احسان احمد، خورشید احمد، شکیل احمد، منیر عالم، ربیعہ، عذرا، طیبہ، نیّرہ کے علاوہ اہلِ خانہ سے الگ مولوی عبدالحق، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا نگرامی، ڈاکٹر فریدی، ڈاکٹر عزیر، ڈاکٹر ذاکر حسین کے حوالے بھی موجود ہیں۔ ان خطوط میں ان کی زندگی کے بعض تکلیف دہ پہلو بھی بڑے دل دوز ہیں۔ معدے، گردے، آنکھ اور عارضۂ قلب کی وجہ سے صحت خراب رہتی تھی اور وہ متفکر بھی رہا کرتے تھے۔ ایک خط میں ڈاکٹر فریدی مرحوم کی پوری رپورٹ درج کی ہے۔ جو کارڈرائیوگرام کی رپورٹ پرمبنی ہے۔ ایک دوسرے خط میں گرتی ہوئی صحت پر تشویش کا اظہار ہے:

"تکلیف کا سلسلہ ہے کبھی زیادہ کبھی کم۔ لیکن اس سے مفر نہیں۔"

''جب حالات بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہوتے جائیں تو کیا کیا جائے۔ یوں بھی اب مجھے کون نوکر رکھے گا۔ جب صحت اور تفکرات کا یہ عالم ہو۔ کہیں جانے کا ٹھکانا نہیں۔''

دوسرے خط کی یہ عبارت بھی غور طلب ہے:

''ایسی بے بسی کا سامنا ہے کہ کبھی زندہ رہنے پر بے غیرتی محسوس ہوتی ہے اور یہ احساس دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔''

''مریض پہ جو گزرتی ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔''

بعض ناقدین نے رشید صاحب کے دائرۂ فکر کو مقامی اور محدود قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ محض کم نگہی ہے۔ وہ عالمی حادثات سے حد درجہ متفکر رہا کرتے تھے۔ ۱۱رمئی ۱۹۶۱ء کے خط میں مشرقی پاکستان کے جان لیوا طوفان کا تذکرہ ہے:

''کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں، سوا اس کے کہ کھلنا اور نواح میں پرسوں شدید طوفان آیا اور اتلافِ جان ہوا، اس سے دل لگا ہوا ہے۔''

۲۷رمارچ ۱۹۶۹ء کے خط میں بھی مشرقی پاکستان کی بدعملی کی خبروں پر تشویش ظاہر کی ہے۔

۲۴رستمبر ۱۹۶۲ء کا خط دلچسپ ہے۔ جس میں ان کے لسانی کرب کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تمام تر وفاداری اردو سے ہی ہے۔ آزادی کے بعد اردو کے سارے حقوق سلب کر لیے گئے۔ رشید صاحب کا اضطراب ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ اس خط میں بھی بین السطور نہیں بلکہ برہنہ طور پر اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر ان کا کرب وطنز ملاحظہ ہو:

''مجھے یقین ہے کہ جس پایہ کی اردو تصانیف ہوتی ہیں اور ان کی جس طرح اشک شوئی کی جاتی ہے، اس سے کہیں ہلکی ہندی کی کتابیں ہوتی ہوں گی جن کو بہت بڑے پیمانے پر انعامات دیے جاتے ہیں۔ لیکن اس پر فکر مند ہونا بے سود ہے۔ اردو والوں کا ان سے کیا مقابلہ! ہندی ملک کی زبان، حکومت کی زبان، قوم کی زبان۔ اس کو فوقیت کا ہر حق حاصل ہے!''

اردو کے حقوق کی پامالی پر جس درد کا اظہار رشید صاحب نے کیا ہے، وہ معاصر ادیبوں کا موضوعِ سخن نہ بن سکا۔ اردو عظیم ثقافت کی ایک علامت ہے اس کو جس آزمائش میں مبتلا کیا گیا وہ کسی آتشِ نمرود سے کم نہ تھی۔ رشید صاحب نے اس آگ سے ہلاکت کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ دوسرے بہت سے مطبوعہ خطوط میں برملا احتجاج و اظہار ملتا ہے۔ ان کے بعض جذبہ و احساس کی پوشیدہ کہانی قلم بند کرنی ہو تو ان کے خطوط سے رجوع کرنا پڑے گا۔

ذاتی خطوط خلوتیانِ راز کے انکشاف میں بہت معاون ہوتے ہیں۔ یوں بھی بہ قول اقبال بھرپور شناسائی کے لیے نہاں خانۂ دل میں اترنا پڑتا ہے۔ ''یک لحظہ بدل درشو'' کے لیے خطوط بہترین وسیلہ بنتے ہیں۔ خواہ شبلی ہوں یا اقبال یا خود رشید احمد صدیقی سے معتبر واقفیت کے لیے ان کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ بہت سے معاملات برسرِ منبر بیان نہیں کیے جاسکتے اور تختۂ دار پر کہنے کے لیے چوبِ نخل کی فراہمی آسان نہیں ہوا کرتی۔ خطوط میں زندگی کے ضمیر کو بے پردہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہ مزاح نگار تھے۔ دوسروں کو مسکراہٹیں بخشتے رہے مگر ان کا وجود اندر سے شعلۂ سوزاں کی طرح آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اقبال کے بعض خطوط کی طرح رشید صاحب کے خطوط کی راکھ کو کریدنے یا جستجو میں ان کے محسوسات کی پرسوز شبیہ کا عرفان ہوتا ہے۔ چھوٹے بھائی سے راز و نیاز کی باتوں کے لیے نہ تردّد تھا اور نہ تشویش۔ وہ برادر خورد کی طرح صرف نیاز مند ہی نہ تھے۔ بلکہ رشید صاحب کے جاں نثار تھے۔ پورے خاندان میں نیاز صاحب سے زیادہ نہ کوئی ان کا محبّ تھا نہ مہربان۔ اس راز داری کا متحمل مکتوب الیہ ہی ہوسکتا تھا۔

> ''اپنے دل کی حالت کس سے کہوں اور کیا کروں اور کس طرح ظاہر داری سے کام لیتا رہوں۔ ان سب میں مبتلا رہا۔ تمھیں نہیں معلوم دنیا میں کسی کو کچھ ہوا، اگر اچھا ہے تو دوسروں کے طفیل سے ہے اور برا ہے تو اس کا تنہا ذمہ دار میں ٹھہرایا جاتا ہوں۔'' (مورخہ ۸/ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

ایک دوسرے خط کی فکر انگیز تحریر ملاحظہ ہو:

> ''اب جاڑے کی آمد کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ عجیب حال ہے۔ ہر موسم کی ابتدا پر یہی خیال آتا ہے کہ اب دوسرا موسم دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ پھر وہ موسم

آجاتا ہے اور زندگی باقی رہتی ہے۔ لیکن اپنے تدریجی زوال کے ساتھ۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر موسم کا آنا اور جانا دونوں خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہر وقت ایک مسرت ہوتی تھی۔ لیکن روزِ اول سے یہی سب اس طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کا رونا کیا۔ واقعات وحالات سے سب کچھ سکھاتے تو کیا ہیں سب کا عادی بنا دیتے ہیں۔ پہلے کچھ مرگِ ناگہاں کا خوف دامن گیر ہوجاتا تھا۔ اب یہ بات کم ہوگئی ہے۔ اس کا عجیب سبب یہ ہے کہ میرے مرجانے کا جانکاہ صدمہ سواتمہارے کسی اور کو نہ ہوگا۔ نہ مجھے کسی سے جدا ہونے کا صدمہ رہے گا۔ موت سے ڈرنے کے جو اسباب ہوتے ہیں وہ میرے لیے تقریباً صفر کے برابر ہیں۔ جن کو صدمہ ہونے والا تھا اور جس کا مجھے بھی ہوتا وہ پہلے ہی چل دیے۔ اب تو دن رات اس کی دعا مانگتا ہوں کہ عزیزوں کا صدمہ نہ دیکھنا پڑے۔"

اس طویل اقتباس سے ان کی مخصوص طرزِ تحریر کے علاوہ فلسفۂ فطرت، انسانی نارسائیاں، متعلقین کی بے نیازی، حیات وموت کی کشاکش، چھوٹے بھائی کی رفاقت کا شدید احساس اور رشید صاحب کی زہرہ گداز تنہائی کی اندوہناک تصویر کا تعاقب کیا جاسکتا ہے۔ شخصیت کا یہی سوزِ دروں ان کی تحریر اور طرزِ بیان کو دل گدازی بخشنے کا باعث بنتا ہے۔

■

مکاتیبِ رشید

(غیر مطبوعہ خطوط)

نیاز احمد صدیقی کے نام

(۱)

۲۳؍جنوری ۱۹۵۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! یہ پیغام ذاکر صاحب نے دیا ہے اس خیال سے کہ دیر نہ ہو میں نے اس کی نقل شاہ معین الدین صاحب کے نام اکسپریس ڈلیوری سے اعظم گڑھ بھیج دیا ہے اور اصل تمہارے نام ملفوف ہے۔ ذاکر صاحب واقعی بے انتہا مصروف رہتے ہیں اور چونکہ کل کنویکیشن ہے اس لیے یہ ہفتہ خصوصیت کے ساتھ بہت مشغول رہا۔

اور کوئی بات قابل تذکرہ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ خلاف توقع اور خدا کے انتہائی فضل سے خورشید یکدم سیلس ٹیکس افسر مقرر کر دیے گئے۔ سلمٰی بہت خوش ہے یہ گزٹیڈ پوسٹ ہے اور اس کی دہلی میں بڑی مان دان ہے۔

کمال کہاں اور کیسے ہیں؟ بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔ خالدہ اور آسیہ کے بارے میں کوشش جاری ہے۔ خدا فضل کرے گا تو کام بن جائے گا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲)

۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء

یونیورسٹی علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۸؍ کا کارڈ مجھے سہ پہر میں ملا۔ تبادلہ کا حکم معلوم نہیں کیوں اور کہاں اٹکا ہوا ہے۔ ۲۸ کا چلا ۲۹؍ کو جو خط رؤف صاحب کا مجھے ملا ہے اس میں بڑے وثوق سے لکھا ہوا تھا کہ

۲۷؍کو حکم ہو گیا۔ لیکن اب تک کچھ نہ ہوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا ہو جاتا تو بڑی سرگرانی سے نجات ہوتی۔ لیکن جو خدا کو منظور ہے وہی بہتر ہے۔ بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳)

یونیورسٹی علی گڑھ

۳۰؍دسمبر ۱۹۵۳ء

عزیزم! تمہارے دو کارڈ ایک ہی دن ملے۔ کل۔ ذاکر صاحب ان دنوں دورہ پر باہر گئے ہوئے ہیں۔ ۱۵/۱۶؍جنوری تک واپس ہوں گے۔ اس وقت ان سے اس کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے کہوں گا۔ یہاں سب لوگ مع الخیر ہیں۔ بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۴)

یونیورسٹی علی گڑھ

۲۴؍مارچ ۱۹۵۴ء

عزیزم! میں الٰہ آباد سے دو پہر آ گیا۔

یہاں سے ۲۲؍کی رات کو روانہ ہوا اور کل میل سے دو پہر آ گیا۔ الٰہ آباد میں مشکل سے ڈیڑھ گھنٹہ قیام رہا۔ کوئی خاص بات قابلِ تذکرہ نہیں ہے۔ موسم البتہ کل سے ابر آلود ہے۔ یہی حال الٰہ آباد کا تھا۔ سبحان علی صاحب سے اب تک نہ مل سکا گو شفیع صاحب سے عذرِ معذرت کر لیا کرتا ہوں۔ ان دنوں ان کا امتحان ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ کسی وقت مل لوں گا۔

بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔

رشید احمد صدیقی

بیر کا درخت بھیجنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ درخت یا تو میں اپنے یہاں لگاتا یا ذاکر صاحب کے یہاں۔ جب اس درخت کے بارے میں یہ وہم ہو تو ضرورت ہی کیا ہے کہ یہ شوق پورا کیا جائے۔

تمہارا ۲۲؍کا کارڈ ابھی ملا۔ میں صدیق صاحب کو خط لکھوں گا۔ میں سرور صاحب کو

تاریخوں کے بارے میں لکھتا ہوں ان کو جو تاریخ مناسب معلوم ہو رکھ دیں۔ میرے لیے سب برابر ہیں۔ صدیق صاحب کے بارے میں مجھے بشیر صاحب کے خط سے بھی معلوم ہوا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۵)

۲۸ر فروری ۱۹۵۵ء

یونیورسٹی علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۲ر کا کارڈ مجھے ۲۴ کو مل گیا تھا۔ کوئی خاص بات قابلِ تذکرہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ بھائی صاحب اپنی تندرستی کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ دراصل تندرستی بحال رکھنے کے لیے احتیاط برتنا آسان نہیں ہے۔ بغیر محنت کے روزی کیسے کمائی جائے گی۔ آرام کرنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ afford دوسری دِقت یہ ہے کہ محنت کرنا جس کے لیے راحت بن گیا ہو وہ کیا کرے۔ دوسرے یہ کہ تیمارداری کے لیے دوسروں کو مجبور کرنا یا دوسروں کا مجبور ہونا بجائے خود میرے لیے سوہانِ روح ہے لیکن خیر یہ سب تو ہوتا رہتا ہے۔ مرزا صاحب کی خدمت میں میرا اسلام نیاز پہنچانا۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہر طرف خیریت ہے کل یہاں کنوکیشن ہے۔ ذاکر صاحب یوں تو اچھے ہو گئے ہیں لیکن کچھ کسر باقی ہے۔ (انفلوئنزے کی) بھائی صاحب کی خدمت میں آداب۔ غزل والا مضمون بعد نظر ثانی علیحدہ سے چھپے گا یونیورسٹی مطبوعات کی حیثیت سے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۶)

۲۳ر جنوری ۱۹۶۰ء

یونیورسٹی علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۱ر کا کارڈ مجھے ملا۔ یہاں بھی ان دنوں سردی بڑھ گئی ہے لیکن زیادہ نہیں۔ حامد عذرا اب تک نہیں آئے۔ حامد کی والدہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اس وجہ سے شاید وہ لوگ روانہ نہ ہو سکے۔ تم نے یکم جنوری کو ریلوے پارسل سے بھیجنے کا ناحق ارادہ کرلیا۔ دیر سے وہ چا ہے آتی تو کیا حرج تھا اور نہ آتی تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ فرمائش تو تفریحاً کر دی گئی تھی کہ شاید کوئی

آتا جاتا لا سکے۔کوئی خاص بات نہیں ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۷)

۷رمئی ۱۹۶۰ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عزیزم،تمہارا کارڈ کل ملا تھا۔ڈاکٹر فریدی نے الکٹرو کارڈیوگرام ملاحظہ کرنے کے بعد یہ خط لکھا ہے۔۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کے کارڈیوگرام (چار عدد) بھیجے تھے۔

They do not show any deterioration of the heart condition this itself is proof of your heart being sound. A either irregularity now and then is of no significance. In case if is worrying you on lot you may try one of the following drugs at a twice....

یہ سب تو ہے لیکن تکلیف کا سلسلہ ہے۔کبھی زیادہ کبھی کم۔لیکن اس سے مفر نہیں ہے۔ ادھر دو تین دن سے موسم پھر ٹھنڈا ہو گیا ہے لُو ختم ہوگئی۔لیکن یہ محض عارضی ہے۔طیبہ کا بھی ایک کارڈ کل آیا تھا۔یہ غریب کسی نہ کسی بہانے یاد کر ہی لیتی ہے۔کاش اسے فراغت اور نام ونمود کا عشر عشیر بھی ہوتا جو دوسرے بد دماغ لڑکیوں کو ہے۔لیکن چین نصیب نہیں کمال نے باہر کا چھپر علاحدہ کر دیا۔اس کی جگہ کمرہ اور برامدے بنانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔سب کو سلام ودعا۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

(۸)

۲۲راپریل ۱۹۶۱ء
ذکاءاللہ روڈ،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

عزیزم!کوئی بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔تمہارا خط کئی دن ہوئے ملا تھا۔اب یہاں گرمی تیز ہونے

لگی ہے۔ادھر طبیعت بھی کچھ اچھی نہیں رہی۔لیکن اس کو کیا کیا جائے۔یہ تو تھوڑا بہت رہتا ہی ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۹)

۲۶/اپریل ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا 22/کا کارڈ مل گیا تھا۔اتفاق سے امتحان کے روپئے ایک جگہ سے آ گئے میں نے مناسب خیال کیا کہ اسی وقت تمہاری طرف منتقل کر دیا جائے۔اب انشاءاللہ مئی کے آخر میں جائے گا۔حکیم صاحب کے خطوط آجایا کرتے ہیں اب ان کے لیے دلچسپی کا یہی مشغلہ رہ گیا ہے۔خطوط سے گزرے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔بڑھاپے میں بالخصوص جب بے چارگی کا یہ عالم ہو اس سے تسکین ملتی ہے۔پھر بھی حکیم صاحب غیر معمولی آدمی نہیں کہ ایسے شگفتہ رہتے ہیں۔ ادھر کئی دن سے موسم ٹھنڈا ہو گیا ہے۔راتیں بالخصوص اچھی ہوتی ہیں۔باوجود کیسی کیسی احتیاط کے طبیعت خراب ہی رہتی ہے لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۰)

یکم/مئی ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

عزیزم! تمہارا کارڈ ملا تھا۔کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔اب یہاں آندھی اور گرد کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔یونیورسٹی آج سے بند ہو گئی۔طبیعت کا حال کچھ یوں ہی سا ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۱)

۶/مئی ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا 4/کا کارڈ ملا۔کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔مرزا صاحب کو میرا

بہت بہت سلام عقیدت پہنچانا۔ ان کی محبت کو کیا کہوں سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے کراں شریفانہ جذبات سے بہرہ مند فرمایا ہے۔ کئی دن سے دن رات میں بالکل نیند نہیں آتی۔ گولی کھاتا ہوں تو صرف رات کو چند گھنٹے سو لیتا ہوں اس سے طبیعت پست ہے اور کسی کام میں جی نہیں لگتا۔

یوں بھی دوسرے عوارض کیا کم تکلیف دہ تھے۔ لیکن کب تک اس کا ماتم کیا جائے گا۔ یہ دن تو جلد یا بدیر آتے ہی ہیں۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۲)

۱۱رمئی ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۹ رکا کارڈ ملا۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ سوا اس کے کہ کھلنا اور نواح میں پرسوں شدید طوفان آیا اور اتلافِ جان پڑا۔ اس سے دل لگا ہوا ہے کہ عذرا کا خیریت کا خط آجائے۔ وہاں اس طرح کے طوفان اکثر آتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ دل لگا ہوا ہے۔ علی گڑھ نمبر کا وہ مضمون عام طور پر پسند کیا گیا۔ آج کل میں فکر و نظر کا نمبر شائع ہونے والا ہے۔ اس میں بھی اس طرح کا ایک مضمون ہے۔ پہنچے تو دیکھنا۔ سب کو سلام و دعا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۳)

۱۲رجون ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۸رجون کا کارڈ ۱۰ کو مل گیا تھا۔ کل اتوار تھا۔ آج دوشنبہ ہے۔ ممکن ہے مجھے بھی آجائے۔ تم جس فشار میں مبتلا ہو اس کا مجھے علم ہے۔ اور اس سے طبیعت کو جیسی پریشانی ہے کیا بتاؤں اللہ سے مانگیے۔ گڑگڑائیے اور کچھ نہ ملے تو اس کی مصلحت پر محمول کر کے چپ ہو رہتے ہیں۔ اس کی مرضی کے مقابلے میں ہماری درخواست کی کیا حیثیت، لیکن جب خدا کا رول اس کے نامعقول بندے ادا کرنے لگیں تو کیا بتاؤں دل پر کیا گزر جاتی ہے۔ یعنی اپنی بے بسی اور بے گناہی

کونہیں دیکھتے اپنے اغراض و مقاصد کو سب پر فوق رکھتے ہیں!! عبرت! بھیا کا زخم رو براہ نہیں ہے۔ جو غلطی ایک بار ہو چکی اور جسے یہاں دو بار اور دہرایا گیا۔ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب جو دیکھتا وہی کہتا ہے غلطی ہوئی۔ جس کا تدارک بمبئی میں ہوگا۔ اگر تدارک کا امکان ہے! یوں زخم میں کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن مندمل نہیں ہوتا اور جہاں تہاں سے سوراخ نظر آتے ہیں۔ اب کل پھر اسسٹنٹ سرجن کو دکھاؤں گا۔ آج تو کالج کے ہی اسپتال میں ڈریسنگ کرالی۔ کمال کل آ گئے۔ دو دن لکھنؤ رہ کر۔ طہرن چلی گئی۔ اس لیے یہ بھی چلے آئے۔ اب یہ شاید پاکستان نہ جائیں۔ طہرن سے کہہ دیا ہے کہ انشاءاللہ دسمبر کی تعطیل میں آسکیں گے۔ صدیق صاحب غالباً ۱۳ کو کراچی پہنچ رہے ہیں۔ ڈاک سے اس وقت تمہارا ۷ کا چلا ہوا کارڈ ملا۔ علی گڑھ کی اس پر مہر بھی نہیں ہے۔ آنے میں جلدی نہ کرو۔ بشیر صاحب کا خط آج آیا کہ صدیق صاحب شاید ۱۵/۲۰ تک آئیں۔ اس وقت بھیا کے لیے پریشان ہوں کہ کہاں لے جاؤں اور کیا کروں!

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۴)

۱۷ر جولائی ۱۹۶۱ء

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۱۳ر کا کارڈ ۱۵ کو مل گیا تھا۔ تم نے جو باتیں لکھی ہیں سب صحیح ہیں۔ لیکن صحیح ہوں یا نہیں ان کو بھگتنا تو پڑتا ہی ہے۔ رات احسان کراچی سے آ گئے۔ بھیا کا زخم بہتر حال میں ہے۔ لیکن اکسرے اکسپوزر وغیرہ کے لیے لکھنؤ جانا ہی پڑے گا۔ مطیع ٹور پر نکلے ہوئے ہیں۔ ۲۰ تک واپس لکھنؤ ہوں گے تو بھیا کو بھی لے جائیں گے تاکہ ڈاکٹر دیکھ لیں اور ریڈیو تھریپی وغیرہ کے بارے میں ہدایت دیں۔ یہ جب سے آئے ہیں کم و بیش پانسو روپے اب تک ان پر صرف ہو چکے ہیں۔ مصیبت میں اخراجات ناگزیر ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی تشفی نہیں ہوتی اور نہ مصیبت ہی کا جواز نکلتا ہے۔ بہرحال ماتم کرنے سے پریشانی دور تو کیا کم بھی نہیں ہوتی۔ اقبال آج کراچی سے ولایت کے لیے روانہ ہو گئے ہوں گے۔ ایک ماہ کی تعطیل ہے۔ اس میں سیاحت کے لیے نکلے ہیں۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۵)

۱۶ر نومبر پنجشنبہ ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! کل فصیح لکھنؤ وغیرہ ہوتے ہوئے آئے۔ انہوں نے اپنا Ph. D. کا مقالہ تیار کرلیا جو ممتحنوں کے پاس بھیج بھی دیا گیا۔ وہ آن کر یہ خوش خبری سناتے تھے کہ ربی اور مطیع کا رشتہ ازسرِ نو بحال ہوگیا۔ یہ سن کر اتنی خوشی ہوئی کہ یقین نہیں آتا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اللہ کا نام لے کر فی الفور عقد کر دیا جائے۔ سارے رسوم لینا دینا دھوم دھڑا کا چاہے جب ہو۔ سب سے ضروری بات عقد کا ہو جانا ہے۔ پھر ہر چیز اپنے قابو کی ہوگی۔ یہاں تک کہ چاہیں گے تو ایک ہفتہ کے اندر ہی سارے رسوم اور برادری کے مطالبات ادا کردیے جائیں گے۔ روپے کا مطلق فکر نہ کرنا۔ فوراً لکھنا جتنی ضرورت ہوگی بواپسی ڈاک بھیج دوں گا۔ لیکن اس مرحلے کو جلد سے جلد طے کردو۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ فصیح نے جو کچھ بتایا وہ کہاں تک صحیح ہے اس خط کا جواب جلد دینا۔

منا یہاں سے اچاٹ ہیں۔ حالیہ سانحات سے اتنے متاثر کہ وہ شاید اقبال یا عذرا کے ساتھ جائیں۔ احسان پابہ رکاب ہیں۔ بھیا کل پاکستان گئے۔ خدا ان کو تندرست اور راہ راست پر رکھے۔ آمین۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۶)

۹ ر دسمبر ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! آج دوپہر تمہارے پچھلے کارڈوں کا جواب دے چکا ہوں۔ اس وقت شام کو ۷ر کا کارڈ ملا۔ جملہ باتیں معلوم کر کے مطمئن ہوا۔ اب انشاء اللہ عنقریب عزیر صاحب سے ملاقات ہوگی۔ ان کا ردِ عمل (Reaction) صحیح ہے۔ غالباً ان کا یونیورسٹی سے سبک دوشی کا زمانہ بہت قریب ہے۔ بے روزگار ہو کر آخر کیا کریں گے۔ سوا اس کے کہ تلاش معاش میں ادھر ادھر نکل جائیں۔ ان کی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔ وغیرہ۔ اچھا کیا اعظم گڑھ ہو آئے۔ میرے لیے

شیروانی وغیرہ نہ بنوانا۔ اب اس طرح کی چیزوں کے اوڑھنے پہننے، اچھا کھانے پینے، سیر وتفریح، تقریب وغیرہ قسم کی چیزوں سے طبیعت بھاگتی ہے اور چاہتا ہوں کہ ان سے سابقہ نہ پڑے۔ میرا مسئلہ تو تم پورے طور پر سن چکے ہو۔ یہ سب اسی کی بدولت ہے اور وہ لاینحل ہے۔ سب کو دعا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۷)

۱۲ر دسمبر ۱۹۶۱ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۱۹ر دسمبر کا کارڈ کل ملا۔ اس سے پہلے بھی ایک خط ملا تھا جس میں تم نے عزیزم اشتیاق کی صحت کے بارے میں لکھا تھا کہ ۲۵ر کو عزیزی رضا کے خاندان میں طے ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ ہمیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک دور ہو جائے گی جو اب تک ربی کی نسبت کے بارے میں تھی۔ کوئی اور بات تذکرے کے لیے نہیں ہے سوا ان افکار کے جو ہر وقت دامن گیر رہتے ہیں۔ اور جن سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ جب ممکنات کو عمل میں آتے نہیں دیکھ رہا ہوں تو ناممکن کے ممکن ہو جانے کی کون امید کرے۔ احسان اب چار پانچ روز میں جانے والے ہیں۔ کمال سے بھی میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو میرے حال سے کب تک باندھ رکھیں گے وہ بھی کچھ اپنے لیے کریں۔ منا سے بھی اس بارے میں گفتگو ہو چکی ہے وہ بھی کچھ کر رہے ہیں۔ میرا ٹرم جبکہ تم جانتے ہو ۱۵ر جولائی کو ختم ہو جائے گا۔ دو سال تک یہ سلسلہ بڑا غنیمت رہا لیکن جب حالات بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہوتے جائیں تو کیا کیا جائے۔ یوں بھی اب مجھے کون نوکری دے گا۔ جب صحت اور تفکرات کا یہ عالم ہو۔ کہیں جانے کا ٹھکانہ نہیں۔ یہاں کے اخراجات کی گنجائش نہیں۔ نورالعین صاحب کو میں پہچان نہ سکا کہ یہ کون صاحب یہاں کب تھے اور کیا تھے کبھی موصوف کو خط لکھو تو میرا بھی سلام لکھ دینا۔

آج اقبال کا خط آیا کہ بھیا کا زخم پھر رسنے لگا اس سے بدحواس ہوں۔ اسی سے ڈرتا تھا۔ پھر اقبال کے خانگی جھگڑے بھی کہ کچھ کم نہیں ہیں غرض خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۸)

جمعہ ۱۹؍جنوری ۱۹۶۲ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۱۵؍جنوری کا کارڈ کل ملا۔ اس سے پہلے بھی ایک ملا تھا۔ مجھے ۱۰ بجے دن ایک جوابی تار بھی موصول ہوا۔ تعجب ہے میرا ایک تفصیلی کارڈ تم کو نہ ملا۔ جو کئی دن ہوئے بھیجا تھا۔ خدانخواستہ کوئی نوع دیگر ہوگا تو خط اور زیادہ پابندی سے جائے گا۔ نہ یہ کہ بالکل بند کر دیا جائے لیکن ہوتا یہی ہے کہ کہیں سے عرصے سے خط نہ آئے یا کوئی تشویش کی خبر پہلے سے ہو اور خط نہ آئے تو تردد ہوتا ہے۔ تم نے ناحق یہ تار دیا۔ بہر حال کوئی خاص بات کہنے کی ہے نہیں۔ یہ البتہ تعجب ہے کہ تم کو میرا خط کیونکہ ملا جو میں حسب معمول بھی کرتا ہوں۔ تمہارے تار کا جواب مریا ہو کے پتے سے دے دیا ہے جیسا کہ تم نے لکھا ہے۔

عذرا اقبال وغیرہ کے یہاں سے خطوط آتے رہتے ہیں۔ منا کے بھی۔ احسان ابھی یہیں ہیں۔ ان کا پروگرام غیر متعین ہے۔ اس کا تمام تر دارومدار بیگم راحت صاحبہ کی آمد پر ہے وہ جو بتائیں گی وہ کیا جائے گا۔ ہفتہ عشرہ ہوا میں نے دریافت کیا تھا کہ اشتیاق سلمہ کی تقریب ہوگی یا کیا؟

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۱۹)

۷؍مارچ ۱۹۶۲ء
ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارے دونوں کارڈ ملے۔ ۳؍ کا کل اور ۵؍ کا آج۔ آج صبح عذرا کلکتہ سے اور منا لکھنؤ سے یہاں آگئے۔ منا کے بارے میں بفضلہ کوئی تشویشناک بات دریافت نہیں ہوئی۔ لیکن ابھی تشخیص اور علاج کے کچھ مراحل باقی ہیں جس کے لیے وہ چار یا پانچ دن بعد پھر لکھنؤ جائیں گے۔ کل حکیم صاحب کا بھی خط ملا جس میں کہا تھا کہ ان دنوں یٰسین صاحب وہاں گئے ہوئے ہیں اسکول کے کام سے۔ عید شاید کل ہو ورنہ پرسو ہوگی۔ ہاں سیاست کے وہ نمبر میں نے پڑھے تھے جس میں الیکشن کے بارے میں لکھا تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے الیکشن کا ہنگامہ ختم ہوا۔

کنگن کے بارے میں معلوم ہوا کہ چار ہوں گے۔ وزن کے بارے میں پھر طے ہوگا۔ بننے کو تو وہاں چار یا پانچ دن میں کبھی بن سکتا ہے۔ منا مطیع کی بڑی تعریف کرتے تھے کہ ان کی وجہ سے بڑے مہنگے مراحل بڑی آسانی سے طے ہو گئے۔ سب لوگ بخیر ہیں سب نے یہ بتایا کہ یہ پپڑی جو ریل سے بھیجی وہ اتنی اچھی نہ تھی۔ جیسے کہ پہلے کی ہوا کرتی تھی۔ بہت ٹھوس ہے اور مزہ بھی پہلے کی طرح نہیں ہے۔ یہ کیا بات ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ حلوائی نے چلتا ہوا کام کیا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲۰)

۲۷؍مارچ ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۳؍ کا کارڈ مجھے ملا۔ پرسوں میری طرف سے ایک کارڈ عزیر صاحب نے لکھا ہوگا۔ اس سے خیریت معلوم ہوگئی ہوگی۔ اس دن میری طبیعت اچھی نہ تھی لیکن شاہ صاحب کو لے کر انجمن کے جلسہ میں جانا تھا وقت تنگ تھا اس لیے عزیر صاحب سے کہنا پڑا۔ میٹنگ سے آیا تو طبیعت اور خراب ہوگئی بالآخر ڈاکٹر انصاری صاحب کو تکلیف دینی پڑی۔ بہر حال وقت گزر گیا اب اچھا ہوں۔ ممکن ہے آج شاہ صاحب واپس جائیں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

اور حالات بدستور ہیں۔

تمہارے ہی پاس روپے بھیجنے میں عجلت نہیں کرتا بلکہ بہت عرصہ پہلے گھر کے خرچ کے لیے کمال کے نام چیک لکھ کر حوالہ کر دیتا ہوں اس اندیشے سے کہ معلوم نہیں کب کیا ہو۔ کم سے کم ایک ماہ تک تو گزر بسر تو ہو جائے اس کے بعد بینک سے روپئے وغیرہ نکالنے کے لیے جھگڑے پڑیں وغیرہ۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲۱)

۲۷؍اپریل ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! آج یوسف صاحب کی لڑکی کی شادی محمود صاحب وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی

سے ہے۔ ذاکر صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ ملاقات کئی بار ہو چکی ہے۔ ان کو اور محمود صاحب کو تمہارے بھیجے ہوئے آنولہ کے مربے کھلائے اور تھوڑی سی پپڑی بھی خوش ہوئے اور پسند کیا۔ دونوں ذیابیطس کے مریض ہیں اس لیے پپڑی کھانے میں محتاط رہے لیکن مربے کی تعریف کی۔ ذاکر صاحب نیند کے لیے اکثر مالش اور غسل سے مدد لیتے ہیں۔ میں نے ان کو تمہارا بھیجا ہوا تیل (کدو کا ہو خش) آفر کر دیا۔ ان کا ملازم اچھی طرح سے اس کی مالش کر دیا کرے گا۔ میں خود یہ سب نہ کرتا نہ کر پاتا۔ تمہاری طرف سے تیل کا یہ دے دینا بہت اچھا ہوا۔ ہو سکا تو پانچ سات دانے مربے کے جورہ گئے ہیں۔ وہ بھی دے دوں گا۔ عذرا شاید ۲۹ رکو جائیں۔ منا کے کاغذات نہیں آئے اس لیے ابھی وہ نہ جا سکیں گے۔ اقبال نزلہ زکام میں زیادہ مبتلا ہو گئے تھے لیکن کار سے لاہور جانا پڑا اس کے بعد آ کر لکھا کہ ٹھیک ہو گیا ہوں لیکن پھر دو ہفتے کوئی خط نہ آیا حالانکہ دوسرے تیسرے دن ان کا خط آجایا کرتا تھا۔ چنانچہ پریشان ہو کر ایکسپریس تار ۲۵ رکو دیا لیکن سہ پہر کو خط آ گیا۔ خیریت سے ہیں۔ تار کا جواب اب تک نہ آیا لیکن اب اطمینان ہو گیا۔ ادھر طرح طرح کی پریشانی اور مایوسی میں ان کو تار بھیجنے پر مجبور ہوتا اور پریشانی میں مسلسل مبتلا رہتا۔ بہت شاق رہا لیکن کیا کیا جائے یہ بھی سب اللہ کی طرف سے ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲۲)

۲۲ رمئی ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۱۹ رمئی کا کارڈ آج ملا۔ آج ہی سمیع کا دعوت نامہ بھی موصول ہوا۔ میں نے ان کو معذرت اور دعاؤں کا خط لکھ دیا ہے۔ عذرا بھی ۲۷ رہی کو واپس جا رہی ہے۔ اس لیے خیال ہے کہ لکھنؤ اور مریاہو کا سفر نہ کیا جا سکے۔ ان دنوں والدہ اقبال کی طبیعت بھی خراب رہی ہے لیکن شرکت و عدم شرکت تقریب پر براہ راست میں نے کبھی کوئی گفتگو نہ کی سب کچھ ان کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے بارے میں پرسوں الٰہ آباد حبیب احمد صدیقی صاحب کو بھی لکھ دیا۔ اب ان کی تحقیقاتی انڈسٹریل ٹریبونل بحیثیت ممبر ہو گئی ہے اور ان کا پتہ نمبر ۷ اسٹریچی روڈ ہے۔ خدا کرے

یہ مہم کامیاب ہو۔ جی لگا ہوا ہے۔ دیکھوں لکھنؤ سے کیا حکم ہوتا ہے۔ بہر حال اطلاع پاتے ہی کہنا۔
اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اب تو یہ دعا ہے کہ یہ تقریب کامیاب ہو۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲۳)

۳۰ رمئی ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا کارڈ ملا۔ اسی کا انتظار تھا۔ گو میں اتنی دور تھا لیکن تقریب کا تصور اتنا گہرا اور غیر منقطع تھا کہ میں اپنی شرکت اس میں محسوس کرتا رہا۔ اللہ کا شکر ہے۔ جیسا سمجھتا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس کی ذات سے یہی امید تھی۔ سمیع کو ایک خط پہلے لکھ دیا تھا ایک آج لکھ دوں گا۔ اب تو دل اسی طرف لگا ہوا ہے کہ مجھ کو توسیع مل جائے ایسا دن دیکھنا نہیں چاہتا تھا ورنہ توسیع کی فکر نہ کرتا کہتا سب چھوڑو ساتھ آ کر رہو آخر تو ایک نہ ایک دن جدا ہونا ہے جب تک ساتھ کیوں نہ رہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ جس حال میں ہوں وہ اپنے ہی لیے کتنا تکلیف دہ ہے اور روز بروز اور بڑھتا جا رہا ہے کہ کسی اور کی کفالت کروں۔ ایسی بے کسی کا سامنا ہے کہ کبھی کبھی زندہ رہنے پر بے غیرتی محسوس ہوتی ہے اور یہ احساس دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ان دنوں تم بڑی دوادوش میں رہے ہو۔ مجھے برابر اس کا تردد رہا ہے۔ اب یہ کرو کہ فی الفور اپنا مکمل چیک اپ کراؤ اور کم سے کم ایک ہفتہ تعطیل مناؤ۔ تقریب کی ہماہمی اکثر بڑی تکلیف کا موجب ہو جاتی ہے اس زمانے میں تم پر جو گزر گئی ہوگی اور جیسی جانفشانی کرنی پڑی ہوگی اس کا مجھے اندازہ ہے۔ بہر حال میرے کہنے پر جلد سے جلد عمل کرو اور سب کو دعا کہو۔ عذرا کلکتہ پہنچ گئی۔ ۲۷ ر کو گئی آج پہنچنے کا تار مل گیا۔ خدا کرے خیریت سے وہ اپنے گھر پہنچ جائے۔ ان دنوں کتنا پریشان رہا ہوں۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۲۴)

۶ر جون ۱۹۶۲ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ایکم کا کارڈ کل مل گیا تھا۔ آج ایک کارڈ ندوہ سے سمیع کا بھی لکھنؤ سے آیا جس میں انہوں نے تقریب کا خیر و خوبی سے انجام پانے کی تہنیت لکھی تھی اور یہ بھی کہ براتیوں کی بڑی خاطر مدارات کی گئی وغیرہ۔ ان کو میں پہلے دو خط لکھ چکا ہوں۔ اس کا بھی جواب لکھ دوں گا۔ منا اور کمال عنقریب عازمِ سفر ہوں گے۔ ایک عذرا کی طرف دوسرا کراچی۔ یہاں صرف احسان رہ جائیں گے۔ بیگم راحت کے آنے کی خبر ہے لیکن ان کا کراچی کا....بہر حال احسان بھی چلے جائیں گے۔ دو ایک ماہ بعد۔ پھر یہاں تنہائی کی تکلیف اٹھاؤں گا۔

اور یوں بھی احسان ہمیشہ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ میری توسیع کا مسئلہ معلق ہے۔ کام تو کوئی رہ نہیں گیا ہے۔ اس کے لیے یو جی سی کا کہنا ہے کہ ڈائریکٹر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرا موجودہ ٹرم 15 رجولائی کو ختم ہو جاتا ہے۔ یہ پانچ سو مل جاتے تھے۔ اس میں دو دو سو کمال اور احسان کے مل کر کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا تھا۔ اندوختہ جتنا ہے وہ معلوم ہے۔ اس پر کب تک کام چلے گا۔ عذرا اپنے گھر پہنچ گئی۔ تار آ گیا۔ جون میں کیوں آؤ۔ ہم دونوں خاصے زیر بار ہیں۔ یہاں بھی نہ کمال ہوں گے نہ منا۔ کاہے کو تکلیف اٹھاؤ۔ آئندہ کبھی دیکھا جائے گا۔ ہم دونوں توسیع کے معاملے میں معلق ہیں۔ عزیر صاحب تو ان دنوں تنہا ہیں۔ گھر والے سب چلے گئے۔ یہ بھی شاید لڑکی کی شادی کے سلسلے میں جولائی میں کراچی نہ جائیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں پروفیسر ہو کر حیدر آباد گئے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲۵)

۱۶ر جون ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مشفقی! تسلیم نوازش نامہ مورخہ ۱۴ر ابھی ابھی موصول ہوا آپ نے جو کام تفویض کیا ہے

اس لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ کل تو اتوار ہے انشاءاللہ پرسوں جواب عرض کر دوں گا۔ نیاز آتے رہتے ہیں وہ آپ کے حسن اخلاق کے گرویدہ ہیں میں آپ دونوں سے زیادہ خوش قسمت ہوں کہ دونوں کا ہوں! منا دہلی ویزا حاصل کرنے کے لیے گئے۔ ممکن ہوا تو کمال وہیں سے ہوائی جہاز پر کراچی چلے جائیں گے۔ کچھ تعجب نہیں منا بھی چلے جائیں یا کلکتہ کی طرف لے جانے کے لیے واپس آئیں۔

یہ خط حبیب صاحب کے نام الٰہ آباد لکھا تھا لیکن اب ان کو تمہارے کارڈ مورخہ ۱۲ر جون کی رسید کے طور پر بھیجتا ہوں۔ حبیب صاحب نے جو پوچھا ہے وہ معلوم ہو گیا اس لیے ان کو علیحدہ لکھوں گا۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۲۶)

۲۲ر ستمبر ۱۹۶۲ء

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۰ رکا کارڈ ملا۔ انعام کی خبر تو کئی مہینوں سے سننے میں آئی ہے۔ کچھ دنوں سے اس کی تصدیق بھی ہونے لگی ہے۔ ممکن ہے کسی وقت مل بھی جائے۔ جبکہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس اعزاز واکرام کا تو مجھ پر کوئی اثر نہیں ہے۔ کبھی اور کوئی وقت ہوتا تو شاید اثر ہوتا۔ البتہ ادھر اخراجات غیر معمولی ہوئے جس کا خیال نہ تھا اس لیے اس سلسلے میں جو رقم مل جائے گی اس سے یہ بار ہلکا ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ جس پایہ کی اردو تصانیف ہوتی ہیں اور ان کی جس طرح اشک شوئی کی جاتی ہے اس سے کہیں ہلکی ہندی کی کتابیں ہوتی ہوں گی جس کو بہت بڑے پیمانے پر انعامات دیے جاتے ہیں لیکن اس پر گلہ مند ہونا بے سود ہے۔ اردو والوں کا ان سے کیا مقابلہ! ہندی ملک کی زبان حکومت کی زبان قوم کی زبان اس کو فوقیت کا ہر حق حاصل ہے۔ بیگم امجد علی کا یہاں بھی خط آیا تھا کہ وہ مریا ہو جانے والی ہیں۔ یہ بات مجھے پسند نہ آئی۔ معلوم نہیں اپنے گھر کون کیسے رہتا ہے کیا باتیں ہوتی ہیں اس میں اس طرح دخل دینا اچھا شیوہ نہیں یگانگت برتنے کا ایک موقع ہوتا ہے اور ایک حد ہوتی اس سے تجاوز نہ ہونا چاہیے۔ آج والدہ اقبال گئیں علاج کے سلسلے

میں ذاکر صاحبؒ کے یہاں قیام ہوگا اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲۷)

۲۷ر ستمبر ۱۹۶۲ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۵ر کا کارڈ ملا۔ نور نظر ضامن کے لڑکی پیدا ہونے کی خبر ملی ہے۔ اللہ دونوں کو خیریت سے رکھے اور خوش وخرم پیدائش کے بعد کی تکالیف کی طرف متوجہ رہنا، اسے جلد دور ہونا چاہیے۔ غالباً مریا ہو میں ولادت ہوئی وہاں ذرا اچھی طبی امداد کم ملتی ہیں۔ کئی دن ہوئے یہاں بھی کافی بارش ہوئی۔ کل رات بھی ہوئی لیکن دن ہوتے ہی مطلع صاف ہو گیا۔ اب جاڑے کی آمد کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ عجیب حال ہے ہر موسم کی ابتدا پر یہی خیال آتا ہے کہ اب دوسرا موسم دیکھنا نصب نہ ہوگا۔ پھر وہ موسم آجاتا ہے اور زندگی باقی رہتی ہے لیکن اپنے تدریجی زوال کے ساتھ۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر موسم کا آنا اور جانا دونوں خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہر وقت کی بھی ایک مسرت ہوتی تھی لیکن روز ازل سے یہی سب اس طرح ہوتا چلا آیا ہے اس کا رونا کیا۔ واقعات وحالات سب کچھ سکھاتے تو کیا ہیں سب کا عادی بنا دیتے ہیں۔ پہلے کبھی مرگِ ناگہانی کا خوف دامن گیر ہو جاتا تھا۔ اب یہ بات کم ہو گئی ہے۔ اس کا عجب سبب یہ ہے کہ میرے مرنے کا جان کاہ صدمہ سوا تمہارے کسی اور کو نہ ہوگا نہ مجھے کسے سے جدا ہونے کا صدمہ رہے گا۔ موت سے ڈرنے کے جو اسباب ہوتے ہیں وہ میرے لیے تقریباً صفر کے برابر ہیں جن کو صدمہ ہونے والا تھا اور جس کا مجھے بھی ہوتا وہ پہلے ہی چل دیے۔ اب تو دن رات اس کی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ عزیزوں کا صدمہ نہ دیکھنا پڑے۔ دو ہی کیا کم جان لیوا ہوئے کہ کسی اور کا صدمہ برداشت کرنا پڑے۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۲۸)

۶/ اکتوبر ۱۹۶۲ء

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا کارڈ آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ کل جمعہ کو عقیقہ پر کوئی مناسب نام تجویز کر کے بھیج دوں۔ لیکن ادھر کچھ ایسے ترددات (ذہنی) میں مبتلا رہا کہ خیال ہی نہیں رہا کہ کیا کرنا ہے۔ اقبال کے بارے میں کوئی ٹھیک بات معلوم نہ ہو سکی کہ چیک اپ کا کیا نتیجہ رہا۔ یوں خطوط آئے احسان کو دہلی تک پہنچا کر ملازم (سکندر) بھی آیا اور وہ بھی اقبال سے مل کر آیا۔ اس سے طبیعت متفکر ہے کل شام یوسف صاحب دہلی سے واپس آئیں گے ان سے تفصیل سے حالات معلوم ہوں گے ورنہ ادھر اتوار اور دسہرہ کی تعطیل پرسوں تک ہے شاید ہی خط و کتابت کی نوبت آئے۔ اقبال کا آج تار آ گیا احسان بخیریت پہنچ گئے۔ ان سے جدائی بھی متاثر کیے ہوئے ہے۔ نئے وائس چانسلر کے آنے اور پرانے کے جانے سے بھی ایک طرح کا تردد ہے۔ غرض یہ کہ کچھ دن بھی ایسے نہیں گزرتے جب کہوں کہ کلی اطمینان ہے۔ یہ عمر ہے جب معمولی واقعہ کا بھی غیر معمولی احساس ہوتا ہے۔ انشاءاللہ عقیقہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا ہوگا اور تم نے کوئی اچھا و مبارک نام بچی کا رکھ دیا ہوگا۔ آئندہ تین دن کی تعطیل میں فصیح لکھنؤ جا رہے ہیں۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۲۹)

۸/ اکتوبر ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارے دو کارڈ آج ساتھ ملے ایک جمعرات ۴/ کا جونپور سے بھیجا ہوا۔ دوسرا شنبہ ۶/ کا مریاہو سے بھیجا ہوا۔ نیرہ کی علالت سے تردد ہوا۔ اللہ تعالیٰ شفا بخشے۔ ٹائیفائڈ اور کالرے کا ٹیکہ بہر نوع لگتے رہنا چاہیے۔ گو خدا کے فضل سے اب ٹائیفائڈ کی مجرب دوائیں نکل آئی ہیں پھر بھی تیمارداروں کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اور مریض پر جو گزرتی ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اقبال شاید پرسوں آئیں لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا آنتوں وغیرہ کی کوئی گڑبڑ نہیں نکلی اور ہندوستان میں اس مرض کی تشخیص

بہتر سے بہتر مواقع سے اور بہتر سے بہتر ڈاکٹروں نے کرلی ہے۔ اس سے اطمینان ہوا کہ بفضلہٖ سب ٹھیک ہے ورنہ یہ دن مجھ پر یاس وامید کے جیسے گزرے ہیں میں ہی جانتا ہوں۔ اسی زمانے میں احسان کا جانا ہوگیا۔ اپنے دل کی حالت کس سے کہوں اور کیا کروں اور کس طرح ظاہر داری سے کام لیتا رہا ہوں۔ ان سب میں مبتلا رہا۔ تم کو نہیں معلوم دنیا میں کسی کو کچھ ہو اگر اچھا ہے تو دوسروں کے طفیل سے ہے اور برا ہے تو اس کا تنہا ذمہ دار میں ٹھہرایا جاتا ہوں۔ ہر ایک کی بیماری اور ناخوشی کا ذمہ دار میں نہیں ہوں بلکہ دوسروں کے عروج اور فراغت بھی میری ہی وجہ سے ہے۔ یہ پوزیشن ہے۔ مرزا صاحب سے بہت بہت سلام کہنا۔ کاش بہتر حالت میں ہوتا کہ ان سے ملنے کی امید کرتا جن تقریروں کا ذکر تم نے کیا ہے وہ سب میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ اور میرا کیا یہاں سب کا رد عمل وہی ہے جو تمہارا ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۰)

۱۹ دسمبر ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا کارڈ کل یا پرسوں ملا تھا۔ رات اقبال معہ اپنی بیوی کے چند دنوں کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ نجات ہوئی تو ایک ہفتے سے کمال Tonslitis میں مبتلا ہیں۔ گلے میں درد اور بخار۔ انجکشن ہو رہے ہیں۔ افاقہ ہے۔ اس دوران ان دونوں کا آنا خوشی کے بجائے فکر کا باعث ہوا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۱)

۸ر جنوری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۵ر کا کارڈ آج ملا۔ فصیح سے تمہارے قیام لکھنؤ کا تفصیلی حال معلوم ہو چکا تھا۔ آج ڈاکٹر فریدی صاحب کا خط بھی آیا کہ انہوں نے مطیع کو باجازت ہی سہی بلکہ ہدایت کی ہے کہ اسپتال کا کام بلرام اسپتال میں ضرور سیکھیں۔ پرائیویٹ ڈاکٹروں کے یہاں وہ باتیں نہیں سیکھ پائیں گے جو صرف اسپتالوں میں سیکھ سکتے ہیں۔ خط بڑی شفقت اور محبت کا لکھا ہے تم سے ملنے اور تحفہ

پانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ گزشتہ سنیچر کو گاندھی لیبوریٹری میں خون کا امتحان کرایا تو Colestrol کی مقدار ۲۰۰ نکلی اس سے پہلے ۱۹۱ تھی اور اس سے پہلے صرف ۱۵۰ تھی پہلے سے بدتر ہے واپسی میں ڈاکٹر انصاری صاحب سے طبیہ کالج میں بلڈ پریشر دکھایا تو ۱۷۰ نکلا جو کبھی نہ ہوا تھا۔ کچھ نہیں پتہ چلتا کہ یہ سب بالخصوص پریشر کیوں بڑھتا رہا۔ اس کی دوا Seapasil کھاتا ہوں لیکن تین دن بعد ۱۶۰ ہوا۔ کبھی خیال میں بھی یہ نہ آتا تھا کہ یہ صورت حال ہوگی۔ بہر حال جو خدا کو منظور۔

رات منیر صاحب لکھنؤ سے آئے۔ غالباً ایک ہفتہ کی رخصت ہو۔ مشفق صاحب آئے ہوئے ہیں۔ کل ملاقات ہوئی تھی۔ شاید کل واپس جائیں۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۲)

۹؍جنوری ۱۹۶۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارے دو کارڈ ملے ایک آج ۷؍ کا لکھا ہوا اور دوسرا اس سے پہلے ۵؍ کا لکھا ہوا۔

پرسوں رات منیر صاحب آئے۔ ادھر ۴-۵ دن سے میرا بلڈ پریشر ۱۰۰-۱۷۰ ہے دواؤں سے مشکل سے ۱۶۰ پر آیا ہے اتنا آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے کھانے پینے چلنے پھرنے میں زیادہ احتیاط شروع کردی ہے۔ ادھر مشفق صاحب آئے تھے۔ سنتا ہوں زکام کھانسی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارے خطوط کمال اور احسان نے دیکھ لیے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۳)

جمعہ ۱۱؍جنوری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۹؍ کا کارڈ ملا۔ میں ڈبل برسٹ کوٹ کیا کروں گا۔ اب تو سردی بھی گزر گئی۔ تم ناحق ایسی چیزوں کی فراہمی پر زیرِ بار ہوتے ہو۔ میں کب کہیں آتا جاتا ہوں کہ اس طرح کے کپڑوں کی ضرورت ہو۔ اس کوٹ پر تم نے جو صرف کیا ہے وہ اس سے بہت بہتر کاموں پر لگایا

جاسکتا تھا۔ مجھے اپنے اوپر روپیہ صرف کرنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اور جہاں تک ہوسکتا ہے ایسی چیزیں جو دوسروں کے کام زیادہ بہتر طور پر آسکتی ہوں نکالتا رہتا ہوں۔ کل ہی کئی ایک چیزیں منیر صاحب کو دے دیں۔ میں تم سے کیا کہوں کہ سوا اس کے کہ بہت ضروری دواؤں اور خط وکتابت کے لیے تو ضرور مجبوراً کچھ خرچ کرتا ہوں ورنہ کسی اور چیز پر بالخصوص اپنے آرام وآسائش کے لیے کوئی چیز حاصل کرنا اور فراہم کرنا بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ قمیص پاجامے اور شیروانی اتنی ہیں کہ مدتوں رہیں گی۔ موسم بھی جلد ہی ایسا آجائے گا۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے لیے زیرِ بار نہ ہوا کرو۔ سکندر کا حال معلوم ہوا۔ اس کی جگہ آدمی نہ ملنے سے ان دنوں دشواری کا سامنا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ دعوتوں کا سلسلہ لازمی اور لامتناہی وہ شخص جو باہر سے آئے علی گڑھ تفریح کے لیے ضرور آئے گا۔ اس کی تواضع ومدارات بڑی کھلتی ہے۔ لیکن علی گڑھ قیام میں یہ روایتیں ناگزیر ہیں۔ سلیپر کیا میں پہنتا ہوں کئی سال ہوئے تم نے بھیجا تھا۔ وہ مدتوں یوں ہی رکھنے کے بعد عذرا کو دیا کہ حامد کو دے دے۔ اس سے سیمنٹ کے فرش پر پھیل کر گرنے کا بڑا اندیشہ رہتا ہے اس لیے اسے استعمال نہیں کرتا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۴)

۱۵ر جنوری ۱۹۶۳ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا بھیجا ہوا کوٹ ان دنوں نہایت آرام دہ ثابت ہورہا ہے۔ گرم ہونے کے علاوہ سلائی عمدہ ہے اور جسم پر بہت فٹ آیا۔ فاختئی رنگ بھی نہایت موزوں ہے۔ جو صاحب یہ چیزیں لائے تھے یعنی بیج میوے کوٹ اور دو عدد کورے رومال ان کی تلاش میں ہوں۔ اسپتال بھی آدمی بھیجا لیکن اب تک پتہ نہیں چلا۔ ذاکر صاحب کی بیگم صاحبہ کے لے حسبِ معمول جونپور کا عمدہ چنبیلی اور بیلے کا تیل منگانا چاہتا ہوں۔ آدھ آدھ پاؤ دونوں تیل کسی ٹین کے ڈبے میں کرکے بذریعہ پارسل بھیج دینا بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ تل کا تیل ہو اور سب سے عمدہ قسم ہو۔ ان کی قیمت بھی لکھ بھیجنا۔ آج کل ۱۶ اسیر سے کم عمدہ تیل کب ملتا ہوگا۔ بہر حال اس کی فکر نہ کرنا کہ سولہ

سیر کا ہے۔اس سے زائد کا۔خالص بھی ہو۔ ہر اعتبار سے Genuine ہو۔کیا تم نے میرے کوٹ کوعطر سے بسا دیا ہے؟ خوشبو آتی رہتی ہے۔آج کی ڈاک دیکھے بغیر یہ خط بھیج رہا ہوں۔۱۴ کو ادھر سے پٹنہ جاتے ہوئے ذاکر صاحب سے اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی تھی۔اب ۱۷ کو واپس ہوں گے اور اسی راستے سے۔اس دن بھی ملاقات ہوگی۔انشاء اللہ۔ بیلے اور چنبیلی میں ایک ہی بھیج سکو تو چنبیلی کو ترجیح دینا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۵)

۶ / مارچ ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بیٹی طیبہ! خدا تم کو خوش رکھے۔کل تمہارا خط ملا اور منا کا بھی۔منا سے کہہ دو کہ اگر ان کے ڈاکٹروں کی رائے ہو تو بے تکلف اسپتال میں داخل ہو جائیں۔اس بارے میں مطیع سے بھی مشورہ کر لیں۔اب جبکہ وہ لکھنؤ آ ہی گئے ہیں تو علاج معالجہ کے معاملہ میں خواہ مخواہ عجلت سے کام نہ لیں۔اس کو مکمل طور پر پورا ہونے دیں۔خرچ کی پروا نہ کریں۔میں روپے بھیج دوں گا۔ یہ خط بھیج رہا تھا کہ فصیح لکھنؤ آج کے میل سے جانے والے ہوئے۔ان کے ہاتھ کچھ پودے گل داؤدی کے بھیج رہا ہوں۔ یہ معمولی ہیں اور ہمارے ہاں سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ان کے suckers علیحدہ علیحدہ گملوں میں یا زمین میں لگا دینا۔ ہر ایک میں سے پندرہ بیس suckers نکلیں گے۔ ان کو نومبر تک دو تین بار بدلنا پڑے گا۔ کچھ تو آخر سال تک بچ ہی جائیں گے۔اب طیبہ کو لکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ فصیح شام تک پہنچ کر سب کہہ دیں گے۔کنگن کے لیے ناپ بھیج دینا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۶)

۲۰ / اپریل ۱۹۶۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا کارڈ اس وقت ۵ بجے ملا۔ بھٹناگر صاحب کے بارے میں کسی سے کچھ

کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کسی کو نہ لکھنا۔ وہ بات آئی گئی ہوگئی اور یہ انہیں کی رائے ہے جس سے تم کو مطلع کر رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ اس دوا دوش میں اپنے کو نہ ڈالنا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۷)

شنبہ ۲۴ / جون ۱۹۶۷ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا مفصل کارڈ غالباً پرسوں ملا تھا جس میں تم نے شکیل سلمہ کی آئندہ تعلیم کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا۔ آج مطیع بھی آئے تھے ان سے معلوم ہوا کہ تمہاری رائے ان کو طبیہ کالج میں داخل کرانے کی ہے۔ پار سال بھی تم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ طبیہ کالج میں داخلہ مشکل نہیں ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہاں تک نفع بخش ہوگا۔ پار سال فصیح سے اور آج مطیع سے دیر تک بات ہوتی رہی۔ پانچ سال کا کورس اس کے بعد تین سال کی ٹریننگ یا امیدواری اور پھر قسمت آزمائی۔ کیا اتنی مدت تک انتظار کرنا مناسب ہوگا جبکہ ہر سال روزگار کے امکانات دشوار سے دشوار تر ہوتے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک میرا خیال ہے شکیل سلمہ کی صلاحیت یا رجحان آزاد پیشہ کی طرف نہیں ہے۔ اس کے لیے اور طرح کی صفات ضروری ہوتی ہیں۔ ان کے لائق جو ملازمت ہو سکتی ہے وہ تعلیم کی ہے جس میں عافیت و عزت کے ساتھ گزر ہو جاتی ہے۔ اس لیے تم نے بی ایڈ کی جو اسکیم سوچی تھی وہ میرے نزدیک زیادہ مناسب حال ہے۔ اس میں اگر وہ ترقی کر سکیں گے تو کر لیں گے۔ طبیہ کالج کا خرچ مجھے ٹھیک نہیں معلوم لیکن شاید کم نہیں ہے۔ میرا حال تم جانتے ہو۔ وہ تو یہ ہے کہ اب تو گھر کا خرچ بھی مشکل سے قابل برداشت ہے۔ کمال کہیں باہر جانے کے لیے پابرکاب ہیں ایسے میں کیا گزرے گی تم قیاس کر سکتے ہو۔ بقیہ کبھی آئندہ۔ اس وقت ایک کام آپڑا ہے۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

(۳۸)

شنبہ ۳/اگست ۱۹۶۸ء

ذاکرباغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ایکم کا کارڈ (ملا) کل میں نے رضا سلمہ کے بارے میں عدیل عباسی صاحب کو بھی خط لکھ دیا۔ شکیل سلمہ کے اس طرح باکار ہو جانے سے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ان پر فضل فرماتا رہے اور ان کی کمائی قابلیت صحت اور نیک نامی میں اضافہ ہوتا رہے اور ان سے ان کے متعلقین و متوسلین کو اس طرح فخر اور تقویت حاصل رہے۔ جیسے بڑے بھیا سے ہم سب کو تھی۔ آمین۔ مطلوبہ رقم میں سے تم کو نصف مل گئی۔ اسے جس طرح چاہو کام میں لاؤ۔ بقیہ نصف کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اسے بھی لینا چاہو گے یا نیّرہ سلمہ کی تقریب کے لیے بقیہ امانت رہنے دو گے۔ یہ بھی بار بار کہہ چکا ہوں کہ جو روپیہ تم کو وصول ہو چکا ہے وہ کسی مخصوص کام کے لیے محفوظ نہ سمجھو بلکہ ضروری کام میں صرف کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ حاجت روائی کرتا رہے گا۔ جیسا کہ اب تک ہوا ہے۔ انعامی کتابوں کا کیا ہو رہا ہے؟ کب تک نتیجہ نکلنے کی توقع کی جاتی ہے۔ سب کو دعا۔ آصف صاحب، فریدی صاحب، نگرامی صاحب سب کو آداب۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۳۹)

۱۲/اگست ۱۹۶۸ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارے دونوں کارڈ ۸/اور ۱۰/ کے لکھے ہوئے آج ایک ساتھ ملے۔ نگرامی صاحب کے ساتھ ۱۸/ کو ضرور آؤ ملے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔ یہ موقع بہت اچھا ہے۔ نگرامی صاحب کے قیام کا بھی بندوبست یہیں رہے گا۔ یوں موصوف کی مرضی جہاں چاہیں قیام فرمائیں۔ نگرامی صاحب کی خدمت میں آداب۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۴۰)

منگل ۱۲ر نومبر ۱۹۶۸ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا کارڈ ملا تھا۔ آج تمہارا بھیجا ہوا صدق کا پرچہ بھی ملا۔ کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔ جو چیزیں بھیجنے کو لکھی ہیں اس کی جلدی نہیں ہے۔ رمضان بعد بھیجنا ہے۔ ملا تو احسان کو کبھی بھیج دوں گا۔ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کوئی جانے والا کب ملے گا اس لیے جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کی قیمت ضرور لکھ دینا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۴۱)

بدھ ۱۳ر نومبر ۱۹۶۸ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۱۲ر کا کارڈ ابھی ملا۔ ایک کارڈ کل ندوہ کے پتے سے بھیج چکا ہوں۔ معلوم نہیں وہ تم کو ملے بھی یا نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی سوا اس کے کہ عطر وغیرہ بھیجنے کی جلدی نہ کرنا۔ کبھی فرصت ملے تو بھیج دینا۔ آج ہی شاہ صاحب کا خط اعظم گڑھ سے آیا ہے۔ جس میں انہوں نے خطبے کی تعریف لکھی ہے۔ تمہارا بھیجا ہوا صدق کا پرچہ بھی کل مل گیا ہے جس میں مولانا نے خطبہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ غالباً تم عبدالطیف اعظمی (اعظم گڑھی) کو جانتے ہو گے۔ یہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کے پرسنل اسسٹنٹ یا سکریٹری ہے۔ اگر کوئی خط کہیں سے خطبہ کے لیے آئے تو اعظمی صاحب کو پتہ لکھ دیا کرو وہ بھیج دیا کریں گے۔ دوسری سہولت یہ ہے کہ یہ خطبہ رسالہ جامعہ کے Latest number میں شائع ہو چکا ہے۔ جن لوگوں کو جامعہ ملتا ہے اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ خطبہ کا مطالعہ اس میں کر سکیں گے۔ خطبے کی قیمت سے فروخت کرنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ایسی چیزیں نہ دوبارہ شائع کی جاتی ہیں نہ ان کے فروخت کرنے کا سوال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فریدی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ وہ تمہارا اتنا خیال کرتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا میں نے نگرامی صاحب کو لفافہ لکھا تھا۔

غالباً ان کے خط کے شکریہ میں لکھا ہو۔ تعجب اس کا ہے میرا خط ۸ر کا لکھا ہوا تم کو (۱۲ر) کو ملے۔ یہاں پوسٹ کرنے میں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ پھر توقف کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ تیرہ سلمہ کی بات کے سلسلے میں اتنی مایوسیاں دیکھ چکا ہوں کہ ابھی سوا دعا کے کچھ اور نہیں کہہ سکتا۔ اللہ فضل فرمائے۔ آمین 'معارف' مجھے برابر ملتا رہتا ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۴۲)

منگل ۷ر جنوری ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا کارڈ ملا تھا۔ والدہ اقبال چند مہینوں کے لیے کئی دن ہوئے پاکستان گئیں اور کمال ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بنارس گئے۔ ۱۴-۱۵ تک واپس ہوں گے۔ ایک عرصہ سے نہ احسان کا کوئی خط آیا نہ عذرا اقبال یا نیازی کا۔ زیادہ پریشانی اس کی تھی کہ عذرا اور نادرہ ایسے سخت آپریشن کے بعد کس حال میں تھیں۔ کیسے کرب میں یہ زمانہ گزرا تھا۔ اس میں والدہ اقبال کا پاکستان کا جانا اور دوسری قباحتیں جو جان کو لگی ہوئی ہیں۔

کل عذرا کا خط آیا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ اب کراچی کے تار کا اور منتظر ہوں۔ کیسے کیسے لوگوں سے ہمدردی کے بجائے کیا سلوک مل رہا ہے۔ اس کا خیال کرتا ہوں تو کیسی نفرت ہوتی ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ ایسی حالت میں مجھے سنبھالے رکھتا ہے۔ ضیاء اللہ کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ فضل اللہ صاحب کے خط سے معلوم ہوا اس سے پہلے قاضی صاحب خط لکھ چکے تھے لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ انتقال کہاں ہوا۔ قاضی صاحب نے ایسا ہی اوٹ پٹانگ خط لکھا تھا۔ کیسا خاندان کہاں اور کس حال میں پہنچ گیا ہے تین چار دن سے سردی بڑھ گئی ہے سب کو سلام دعا۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۴۳)

دوشنبہ ۲۷ر جنوری ۱۹۶۹ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! کل تمہاری بھیجی ہوئی پڑی اور گزک وغیرہ ملیں جن صاحب کے ذریعہ سے ندوہ والا خطبہ بھیجا ہے وہ ابھی تک نہ ملے۔ کسی دن آجائیں گے ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ رضی سلمہ یہ چیزیں لائے ہیں اور فصیح پہنچا گئے۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے ادھر دو تین ہفتے سے نظام لکچرس ریڈیو کی ایک تقریر اور مشاعرہ غالب کے افتتاح کے سلسلے میں لکھنے پڑھنے کا کام بہت بڑھ گیا ہے اس کے غیر معمولی Strain سے آنکھوں میں تکلیف ہے اور زبردستی کام کرنے سے تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ فروری کا پورا مہینہ بڑی دوڑ بھاگ اور کلفت کا ہے۔ اللہ مدد فرمائے۔ ان دنوں تم چیزیں بھیجنے میں کافی زیر بار ہوئے ہو۔ عنقریب کچھ بھیجوں گا ذرا یکسو ہولوں۔ سب کو آداب۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۴۴)

۱۷ر مارچ ۱۹۶۹ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۱۰ر کا کارڈ ملا۔ اللہ تعالیٰ ہر کام کو خیر وخوبی سے تمام کو پہنچائے۔ بس یہی دعا ہے۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ ندوہ والے خطبے کے چند نسخے میری فرمائش پر یہاں کے طبیہ کالج کے کسی طالب علم کے معرفت بھیجی تھی۔ وہ نہ ملی۔ اگر طالب علم کا نام معلوم ہو تو لکھنا۔ دریافت کراؤں گا۔ یہ خیال کر کے تم ۱۲-۱۳ تک لکھنؤ پہنچ جاؤ گے۔ ایک کارڈ لکھا تھا۔ نگرامی صاحب کے پتے پر۔ مگر اس میں کوئی اہم بات نہیں لکھی تھی، خیریت کا خط تھا۔ سب کو دعا۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

(۴۵)

۲۷/مارچ ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۳/کا کارڈ ۲۵/کو مل گیا تھا۔ ندوہ والے خطبے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ طبیہ کالج کے کوئی طالب علم تھے جن کی معرفت تم نے میری فرمائش پر چند نسخے بھیجے تھے۔ وہ چونکہ اب تک نہ ملے اس لیے تم کو لکھا تھا کہ وہ کون طالب علم تھے وغیرہ۔ ادھر مشرقی پاکستان میں بدعملی کی جو خبریں ملتی تھیں وہ بڑی تشویشناک تھیں۔ وہاں ڈاک اور تار کی بھی گڑبڑ تھی اس لیے کسی کو کوئی خبر نہ ملنے سے بڑی تکلیف رہی۔ مدتوں بعد اب خبر ملی کہ خدا کے فضل سے بچے سب مع الخیر ہیں۔ یہ کیسی بدامنی اور سفاکی کے حادثے ہوتے رہے۔ ممکن ہے حالات بدلنے سے اب امن چین ہو جائے۔ فصیح و مطیع دونوں ملازم ہو گئے۔ خدا تندرست رکھے اور کامیاب بنائے۔ آمین۔ ابھی کوئی دو ہفتے ہوئے مولانا علی میاں صاحب کو ایک خط لکھا تھا یونین نے اپنے ایک سمینار کے افتتاح کی درخواست کی تھی۔ معلوم نہیں وہ خط ملا یا نہیں۔ انعامی کتابوں کا کیا رہا؟ تم جس کام سے ۲۳ تک ٹھہرے تھے اس کا کیا رہا؟ احسان کا بھی خط آ گیا ہے۔ سب خیریت ہے۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۴۶)

۴/اپریل ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا یکم اپریل کا کارڈ ابھی ملا۔ تم نے یہ نہ لکھا کہ ۲۳/کو جن لوگوں سے نسبت کے بارے میں بات ہونے والی تھی اس کا کیا نتیجہ رہا۔ میں سمجھتا ہوں کوئی نتیجہ خیز بات نہ نکلی۔ اللہ کی مرضی سے کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔ اللہ کا فضل شاملِ حال ہے۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۴۷)

۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا دستی خط ۱۵ر کا لکھا ہوا آج ملا۔ تین دن ہوئے کارڈ بھی ملا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب کا خط بھیجتا ہوں یہ میرے خط کے جواب میں ہے اس کا جواب لکھ دیا ہے۔ یہ بھی کہ میں نے اس کو تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔

جو صاحب تمہارا دستی خط لائے تھے ان سے کہہ دیا ہے کہ جب ان کا جی چاہے آجایا کریں۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔ بارش ہونے لگی ہے اس لیے موسم غنیمت ہو گیا ہے۔ سب کو دعا۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۴۸)

۸ر اگست ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۷ر اگست کا کارڈ ابھی ملا۔ اپنے قرض کی ادائیگی کب سے شروع کرو گے۔ اور ماہانہ قسط کیا ہوگی۔ فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ سامان کر دے گا۔ یہاں کئی دن سے مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ موسم ٹھنڈا ہے۔ کوئی خاص بات قابل تذکرہ نہیں ہے۔ مطیع سلمہ کا خط کل آیا تھا۔ خوش اور بخیریت ہیں۔ سب کو واجبات۔ یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ تم نے کھانے اور ناشتے کا سامان سمیع سلمہ کے یہاں کر لیا ہے۔ دونوں items میں کیا دو گے؟

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۴۹)

۹ راگست ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا بدھ ۶ راگست کا کارڈ آج ملا۔ صدق نے ذاکر صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے یا ایسوں کے بارے میں لکھا کرتا ہے اس سے واقف ہوں۔ ایسے مذہبی لوگ جیسے مولانا ہیں اور ایک بزرگ بجنسہٖ یہاں بھی ہیں ان کے بارے میں میری مستقل رائے ہے کہ ان سے زیادہ حاسد کینہ پرور اور Perverted دوسرا نہ ہوگا۔ یہ دنیا کی ہر نعمت اپنے لیے چاہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اس پر پیچ وتاب کھاتے ہیں کہ دوسرے کو وہ نعمتیں کیوں ملی ہیں۔ میرے نزدیک ایسوں سے زیادہ خدا کا نافرمان بندہ کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ شیطان ان سے زیادہ معتبر ہوتا ہے۔ تمہارا خیال مجھے ہے ذاکر صاحب پر اب تک سب سے بہتر مضمون اردو میں صباح الدین صاحب کا ہے۔ شاہ صاحب نے شذرے کے آخر میں مولیوں کی ایسی تنگ دلی کا نمونہ پیش کیا ہے جس کا ہر اچھا شخص شاکی رہتا ہے۔ جالندھر کے قریب کشمیر جاتے ہوئے ذاکر صاحب کو جو حادثہ پیش آیا جس کا ذکر تم نے کیا ہے وہ تم نے کہاں پڑھا؟ تمہارے لکھنے سے مجھے بھی خیال آنے لگا ہے۔ بہرحال جو گستاخانہ کلمہ یا اشارہ کیا تھا جواب لکھا تو اسے اپنے مضمون میں ظاہر کردوں گا۔ ایڈیٹر 'صدق' اور ان کے قبیل کے بارے میں غالب کا یہ مصرعہ حرفِ آخر ہے۔ ٹیڑھا لگا ہے خط قلم سرنوشت کو، پچھلے خط میں میں نے پوچھا ہے کہ تم دو ہزار قرض کی قسط کتنی اور کب سے ادا کرنے لگو گے تا کہ اس کا انتظام کردوں۔ خدا کے فضل سے ہر طرف خیریت ہے۔ فصیح کا بھی خط ملا۔ خوشی اور خیریت سے ہیں۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۵۰)

۱۳ رستمبر ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ایک کارڈ ۸ رکو ملا تھا اس پر دو تاریخیں تحریر تھیں۔ یکم ستمبر مریا ہو اور ۳ رستمبر مریا ہو۔ اس کے بعد پھر نہ معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ واپس پہنچے یا نہیں۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں

ہے۔ بفضلہٖ سب مع الخیر ہیں۔ فصیح کا خط آیا تھا بخیر ہیں۔ البتہ ادھر مطیع کا کوئی خط نہیں آیا گو فصیح کے خط سے خیریت معلوم ہوگئی۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۵۱)

۱۵ر ستمبر ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۱۳ر کا کارڈ ملا۔ اب تم یہ لکھو کہ جو روپے تم کو مل چکے ہیں اس کے بعد کتنی اور رقم کی ضرورت ہوگی جسے ملنے کے بعد تم پر قرض وغیرہ قسم کی کوئی رقم باقی نہ رہے گی۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ قرض تم بالاقساط کس آسانی وسہولت سے ادا کرتے رہوگے۔ چاہتا ہوں کہ اس تقریب سے تم فارغ ہو تو تم پر ایک پیسہ بھی کسی کا ادا کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔

اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ان روپیوں کے بارے میں کسی کو خبر نہ ہو۔ بچیوں تک سے اس کا ذکر نہ کرو۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

(۵۲)

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! تمہارا ۲۴ر کا کارڈ ۲۶ر کو مل گیا تھا۔ وہاں سے واپس آنا تو نصف پاؤنڈ کمال کے لیے Lapchu Golden orange کی چائے لیتے آنا۔ اقبال آئے تھے تو لائے تھے شاید کہ ۱۲ پونڈ کے حساب سے ملتی ہے۔ یہ ضرور اطمینان کر لینا کہ پرانی رکھی ہوئی نہ ہو۔ دہلی میں بھی کبھی کبھی مل جاتی ہے۔ کلکتہ میں شاید آسانی سے مل جائے اور کوئی بات نہیں ہے۔ سردی بہت معمولی ہے۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۵۴)

منگل ۱۵؍مئی ۱۹۷۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیزم! ادھر تمہارے ۳ کارڈ ملے۔ آخری ۱۰؍مئی کا لکھا ہوا۔ کل ۱۴؍کو ملا۔ یہ معلوم کر کے ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی کہ حکومت کی طرف سے ایک اسکیم کے ماتحت تم کو بھی سو روپئے ماہوار کی پنشن ملے گی۔ کچھ بھی نہ ملتا تو یہ سو روپئے بسا غنیمت ہیں۔ یہ ایسی خوشی ہے خاص طور پر تمہاری خاطر کہ دل حکومت کا شکر گزار محسوس کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تا دیر مبارک فرمائے۔ ان دنوں بچوں کی خیریت معلوم ہونے میں دیر ہوئی۔ اس لیے طبیعت متردّد ہے۔ موسم بہت خراب رہنے کے بعد دو روز سے کچھ اعتدال پر آیا ہے۔ تند آندھیوں اور گرد وغبار کے بعد حالات بدستور ہیں۔ سب کو دعا۔

تمہارا ، رشید احمد صدیقی

■

سید آل حسن زیدی کے نام

(۱)

ذکاءاللہ روڈ، ذاکر باغ ۵ر ستمبر ۱۹۶۴ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکرمی! تسلیم جاڑے کے پھول کی ایک قسم ہے جس کا نام Gerbera (جربیرا) ہے۔ ایک قسم سنگل کی ہے دوسری ڈبل کی۔ سنگل ہر جگہ مل جاتی ہے۔ میرے یہاں بھی بکثرت ہے۔ ڈبل کی اچھی قسم دہرہ دون میں ملتی ہے۔ کسی اچھے نرسری یا باغ کے مالی سے دریافت فرمائیں گے تو وہ بتادے گا۔ مجھے اس ڈبل پھول کے جربیرے Gerbera ڈھائی درجن پود درکار ہے۔ کیا آپ کی کوشش اور کرم سے یہ چیز مل سکتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ قسم اعلیٰ اور ڈبل ہو کیا دام ہوں گے؟ تاکہ میں روپئے بھیج دوں۔ اگر وہاں کوئی اچھی نرسری یا پبلک گارڈن ہوگا تو یہ چیز ضرور مل جائے گی۔ کسی معتبر مالی کو کچھ انعام کے طور پر دے دیا جائے گا تو وہ فراہم کردے گا۔ ممکن ہے ملٹری اکیڈمی یا فارسٹ ڈپارٹمنٹ کے کسی مالی سے کام چل جائے۔ آپ کا بڑا کرم ہوگا۔ اگر اس سلسلے میں آپ میرے لیے زحمت اٹھائیں گے۔ اس غائبانہ بے تکلفی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دہرہ دون میں کوئی شناسا نہیں ہے اس لیے یہ تکلیف دیتا ہوں۔

نیازمند ، رشید احمد صدیقی

(۲)

۱۱ر ستمبر ۱۹۶۴ء

ذکاءاللہ روڈ، ذاکر باغ،

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی، تسلیم، گرامی نامہ مورخہ ۹ر ستمبر ۱۹۶۴ء کل شام موصول ہوا۔ یہ معلوم کرکے خوشی

ہوئی کہ مطلب براری ہو جائے گی اتنی ہی ندامت بھی ہے کہ آپ کو زحمت دی۔ اس سلسلے میں اتنا اور عرض ہے کہ ایک صاحب سے پتہ لگا کہ حسب ذیل ایک نادیدہ مکرم ان کو بھی لکھ دیا تھا ان کا کوئی جواب نہیں آیا ہے۔

احتیاطاً آپ کو اطلاع دے دیتا ہوں کہ ممکن ہو اور آپ مناسب سمجھیں تو موصوف سے مل لیں تا کہ وہ بھی Gerbera (جربیرا ڈبل) کی کچھ پود بھیجنے والے ہوں تو آپ سے انتظام کر لیں۔ اس طرح ایک ساتھ آجائیں گے۔ ضرورت سے زائد نہ ہو پائیں گے اور ان کی خوبی بھی متیقن رہے گی۔ بہر حال مشورہ کر لینے میں آپ دونوں کو ضرور زحمت ہوگی لیکن اس میں میرا فائدہ ہے۔

پتہ یہ ہے: مظہر محمد صاحب ایڈووکیٹ نمبر ۴۳، گاندھی روڈ، انعام اللہ بلڈنگ، دہرہ دون

پارسل بھیجنے سے پہلے مطلع فرما دیجئے گا تا کہ یہاں مناسب انتظام کر سکوں۔

نیازمند ، رشید احمد صدیقی

(۳)

ذکاء اللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۴ر ستمبر ۱۹۶۴ء

مکرمی۔ تسلیم۔ والا نامہ مورخہ ۲۱ر ستمبر ۱۹۶۴ء صادر ہوا۔ شکریہ

ڈبل جربیرا (Gerbera Double) کے بارے میں مقامی ماہرین کا مشورہ اہم ہے اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر پودا اکتوبر کے آخری ہفتہ میں بھیجا جائے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ مظہر محمد صاحب سے فرما دیا کہ اس سلسلے میں موصوف زحمت نہ فرمائیں۔ میں خود شرمندہ ہوں کہ زحمت دی۔ با ایں ہمہ شکر گزار ہوں۔

آپ جس ذریعہ سے پسند فرمائیں اور مناسب سمجھیں اسی سے روانہ فرمائیں۔ البتہ مجھے پہلے سے مطلع کر دیں تا کہ پارسل کی وصول یابی میں زحمت یا دیر نہ ہو۔

دعا گو

رشید احمد صدیقی

(۴)

۱۴؍اکتوبر۶۴ ۱۹ء
ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم۔آداب۔اب تو موسم خشک ہے اور جر بیرا کے بھیجنے کا موزوں وقت آ گیا ہے۔ لیکن میرے کہنے پر نہ جائیے جب مناسب سمجھئے اس وقت بھیجئے۔امید ہے مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔

مخلص ، رشیداحمد صدیقی

(۵)

ذکاءاللہ روڈ، ذاکر باغ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۸؍اکتوبر۶۴ ۱۹ء

محترمی، تسلیم۔گرامی نامہ کل موصول ہوا۔آپ کے کرم سے قوی امید ہے کہ جر بیرے کی پود اوائل نومبر میں مل جائے گی۔امید ہے آپ کے ذہن میں یہ بات بھی ہوگی کہ آپ کو جو یہ تکلیف دے گئی ہے وہ 'حسابِ دوستاں' کی بنا پر ہرگز نہیں ہے۔اس پود کے حاصل کرنے میں جو خرچ ہوا ہوگا وہ میں فی الفور ادا کروں گا۔میری خوش قسمتی یہ کیا کم ہے کہ آپ کے کرم سے اتنی اچھی چیز اس آسانی سے مجھے مل جائے گی۔ایسا نہ ہوتا تو غائبانہ طور پر اس بے تکلفی کی کبھی جسارت نہ کرتا۔آپ کی وجہ سے مجھے وہ سہولت مل گئی جو آسانی سے کسی اور طور پر نہ میسر آتی۔برائے کرم مطلع فرمائیے کہ پود فراہم کرنے میں آپ کو کتنا خرچ کرنا پڑے گا اور پارسل کے اخراجات کیا ہوں گے تاکہ یہ رقم میں پیشگی بھیج دوں۔البتہ یہ ذرا تفصیل سے لکھ دیجئے گا کہ بس سے یہ پارسل کس طرح چھڑانا پڑے گا۔کون سی بس ہوگی۔کس وقت کس Stand (اڈّے) پر پہنچے گی۔تاکہ میں اسی کے مطابق ملازم کو ہدایت کردوں کہ وہ کس تاریخ کو کس بس اسٹینڈ پر کس وقت پہنچ جائے۔شکریہ

مخلص ، رشیداحمد صدیقی

(۶)

۱۴ر نومبر ۱۹۶۴ء

ذکاء اللہ روڈ، ذاکر باغ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مجی، تسلیم۔ نوازش نامہ مورخہ ۱۲ر نومبر ابھی ابھی موصول ہوا۔ جس میں آپ نے اطلاع دی ہے کہ جر بیرا کی پود ۱۷ر نومبر صبح ساڑھے سات بجے بس سے روانہ کردی جائے گی اور مجھے اسی دن ساڑھے ۴ یا ۵ بجے دن کو سرکاری بس اسٹینڈ پر سے لے لینا چاہیے۔

آپ نے جو ہدایات دی ہیں ان پر انشاء اللہ عمل کیا جائے گا۔ آپ کا کرم کہ میری خاطر آپ نے اتنی زحمت اٹھائی جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ پچھلے عریضے میں کچھ باتیں بھی عرض کی تھیں جن کا جواب آپ نے نہ دیا! اب پارسل موصول ہو جائے تو اس سلسلے میں کچھ کر دیں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۷)

۳۰ر نومبر ۱۹۶۴ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ محترم! سلام شوق۔ کچھ دن ہوئے نوازش نامہ آیا کہ فلاں تاریخ کو جر بیرا روانہ کیا جائے گا دوسرے دن تار ملا کہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ اگلے دن خط سے معلوم ہوا کہ بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ آئندہ بھیجنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ سوچا کہ پارسل چار چھ دن میں آجائے گا اس کے بعد شکریے کا خط لکھوں گا اور اس سلسلے میں آپ کو جو زحمت اور زیر باری ہوئی اس کی تلافی کی کوشش کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کچھ نہیں ہو سکا ہے اس لیے خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے خط نہ بھیجنے کو آپ کسی اور بات پر محمول کریں۔ اس لیے آج اس نیاز نامہ کو روانہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے میری بے تکی فرمائش پر جس غیر متوقع تکلیف وکرم کا اظہار کیا اس سے نادم بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔ میں نے یہ فرمائش اس بے تکے یا طریقہ سے کی جس سے آپ سے دیرینہ شناسائی اور بے تکلفی تھی۔ فرمائش کی تعجیل میں آپ نے جس تن دہی سے کام لیا اس سے اس کا اظہار ہوا کہ

غائبانہ طور پر میں نے آپ کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ غیر متوقع طور پر صحیح ثابت ہوئی۔ اللہ آپ کو خوش اور نیک نام رکھے۔ اب میری درخواست ہے کہ جر بیرے پر لعنت بھیجیں اور میرا شکریہ قبول کیجئے۔ یہ فرمائش ہرگز ہرگز ایسی نہ تھی کہ اس کے لیے ایسے شریف النفس پر خواب وخور حرام کر دیا جائے جو ہوا سو ہوا۔ جر بیرانہ ملا لیکن اس کے عوض آپ جیسا مخلص کرم فرما مل گیا۔ سودا برا نہیں رہا۔

آپ کا ، رشید احمد صدیقی

(۸)

۵/جنوری ۱۹۶۷ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکرمی! سلام مسنون

پچھلے عنایت نامہ کا جواب کل بھیج چکا ہوں اور کل ہی شام کو آپ کے بھیجے ہوئے جاڑے کے پھولوں کی پود موصول ہوئی۔

یہ کیا معلوم تھا کہ معذرت مزید عنایتوں کا پیش خیمہ تھی!

سبحان اللہ والحمد للہ۔ شکریہ قبول فرمائیے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۹)

ذکاء اللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۵/جنوری ۱۹۶۸ء

محترمی! تسلیم۔ عید کا تہنیت نامہ موصول ہوا۔ آپ نے جس محبت سے یاد فرمایا اس کے لیے دل سے شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کے احباب اور اعزاء نئے سال کی برکتوں اور عید کی خوشیوں سے پورے طور پر بہرہ مند ہوں اور ہر گزند سے محفوظ و مسبوک رہیں۔ آمین!

متعلقین کو میری دعا پہنچائیے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۰)

یکم جنوری ۱۹۶۹ء ذکاءاللہ روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجبی و محترمی! آداب

والا نامہ مورخہ ۲۸/دسمبر ابھی صادر ہوا۔ عید اور نوروز کی تہنیت پا کر خوش اور شکر گزار ہوا۔ اللہ آپ کو بھی یہ خوشیاں بیش از بیش ارزانی فرمائے۔

امید ہے مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۱)

۷/اگست ۱۹۶۹ء ذاکر باغ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم! سلامِ شوق۔ کئی سال ہوئے آپ نے میری فرمائش پر جربیرا Gerbera ڈبل اور سنگل کی کچھ پود بھیج دی تھی۔ پھولے ضرور لیکن نہ ایس کہ جیسی توقع تھی۔ بتایا یہ گیا تھا کہ دہرہ دون کے جربیرے میدان میں کبھی کامیاب رہتے نہیں۔ آپ کے کسی معتبر مالی سے دو ایک درجن سنگل اور ڈبل دونوں قسموں کے کچھ انعام یا قیمت دے کر خرید لیجیے اور جس طرح گزرے سال بس سے بھیج دیے تھے ویسے ہی اس سال کیجیے غالباً اس کا بہتر زمانہ ستمبر یا اکتوبر ہوتا ہے یہ بات مالی بتادے گا۔ آپ مطلع فرمائیں کہ کس زمانے میں یہ بھیجے جائیں گے میں روپے بھیج دوں گا اور چیز مل جائے گی۔ تکلف نہ فرمایئے میرے لیے یہ کیا کم ہے کہ آپ کی توجہ سے چیز اچھی مل جائے گی اور بکفالت!

امید ہے مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

(۱۲)

یکم ستمبر ۱۹۶۹ء ذاکر باغ، علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی! تسلیم۔ ۲۹ر کا نوازش نامہ پرسوں شام (شنبہ) کو موصول ہوا تھا۔ آپ کے کرم کا شکر گزار ہوں کہ Gerbera Double کی کچھ پودا اکتوبر میں مل جائے گی۔ یہ چیز یہاں آس پاس نہیں ملتی۔ سنگل ملتے ہیں لیکن وہ قابل لحاظ نہیں ہوتے۔ جر بیرا کے ساتھ سرمائی پھولوں کی کوئی اور پودنہ بھیجئے گا۔ اس لیے کہ وہ میرے یہاں بہت اچھے اقسام کے موجود ہیں۔ آپ نے پچھلے بار بھیجے تھے اس لیے اس سال بھی عرض کرنا پڑا۔ ایسا ہی ہے تو وہاں کسی اچھے باغ کے مالی سے دریافت کیجئے گا کہ اعلیٰ درجہ کے Dehlia ڈہلیا کے Cutting تراشے یا ان کے bulbs مل سکیں گے یا نہیں۔ پود یا بیج بالکل نہیں درکار ہیں۔ میرا خیال ہے کوہستانی علاقہ ہونے کے سبب سے وہاں بہت عمدہ ڈہلیا ملتا ہوگا۔ اگر مستند قسم کے ڈہلیا مل جائیں تو پان سات روپے خرچ کر دینے میں کوئی حرج نہیں فرمائیں۔ منی آرڈر سے بھیج دوں گا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۳)

۱۹ر ستمبر ۱۹۶۹ء ذاکر باغ، علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زیدی صاحب مکرم! آداب

نوازش نامہ کے ساتھ جر بیرا کے پودوں کا پیکٹ بھی ملا کل رات گئے یہ تحفہ وصول ہوا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جو عزیز اسے لائے تھے ان کا علی گڑھ کا پتہ کیا ہے۔ معلوم ہو تو مطلع فرمائے گا تا کہ ان کا شکریہ ادا کر دوں۔ آپ نے میری فرمائش پوری کرنے میں جس محبت کا اظہار کیا جتنی زحمت اٹھائی (غالباً زیر باری بھی جس سے آپ نے انکار فرمایا ہے) اس سے بہت متاثر ہوا اور رہوں گا۔ سوچتا ہوں یہ سب میرے لیے آخر کیوں؟ پھر عزیزوں اور دوستوں کی خلقی شرافت کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس شرافت سے متمتع ہونے کا مجھے موقع ملا۔ خدا خوش

رکھے۔آمین۔

اس خط کو دفتر جامعہ اردو میں بھیجوں گا وہ پتہ مکمل کر کے پوسٹ کر دیں گے۔ مجھے صرف نیو فارسٹ یاد رہ گیا ہے۔آپ کے دفتر کا پتہ نثار قریشی صاحب (جامعہ اردو) لکھ دیں گے۔سب کو دعا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۴)

۲۳ر ستمبر ۱۹۶۹ء ذاکر باغ

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زیدی صاحب مکرم! آداب۔۲۰ر کا نوازش نامہ کل شام موصول ہوا۔پودوں کے بارے میں آپ کی ہدایات پر پورے طور سے عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مکرمی صاحب والی پود (۲) کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا۔ان پودوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے نسب کیا گیا ہے۔میری جو کتابیں علی گڑھ میں مل سکتی ہیں ان کے بارے میں ہدایت کر دی ہے کہ آپ کی خدمت میں جلد بھیج دی جائیں۔مل جائیں تو مطلع فرمائیے گا۔اس کے بعد دیکھوں گا کہ اور دوسری کتابیں کہاں ملتی ہیں۔وہ بھی انشاءاللہ حاضر کروں گا۔سب کو دعا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۵)

۹ر مئی ۱۹۷۰ء ذاکر باغ

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم! آداب۔ایک مدت سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ یہاں تک کہ جربیرا کا موسم آ گیا۔پارسل جو آپ نے بھیجے تھے وہ سب بہت اچھے تھے لیکن ان میں اول درجہ کا مسٹر مکرجی کے یہاں کا تھا۔دوسرے نمبر پر ورما صاحب کا۔غالباً نام صحیح لکھ رہا ہوں۔مختصر یہ کہ تینوں غیر معمولی تھے۔آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ اس کے بھیجنے اور نسب کرنے کا سب سے اچھا زمانہ مئی مہینہ کا ہوتا ہے۔ چنانچہ یاد دہانی کرتا ہوں۔دعا ہے کہ آپ اور متعلقین مع الخیر ہوں۔ان پودوں کو حاصل کرنے میں

مالیوں کو کچھ نہ کچھ انعام دینا پڑتا ہوگا پھر بھیجنے کا خرچ وہ سب آپ مجھ سے وصول کرلیا کریں تو اور زیادہ خوش ہوتا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۶)

دوشنبہ ۶ / جولائی ۱۹۷۰ء ذاکر باغ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زیدی صاحب مکرم! پرسوں شام ۴/ کو ایک صاحب آپ کا عطیہ ڈبہ دے گئے جس میں ڈیلیا کی گرہ اور کچھ تراشے تھے۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے دیر میں پہنچایا اس لیے کہ ملفوفہ تراشے مردہ ہو چکے تھے۔ ڈیلیا ناحق بھیجے میرے یہاں اس کے بڑے اعلیٰ نمونے ہیں جس کا قطر ایک فٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے ڈیلیے اس نواح میں شاید ہی نظر آئیں۔ اس طرح گلاب اور سرمائی پودے بھی بہت اچھے دستیاب ہیں۔ باوجود کوشش جربیرے کے اچھے پودے نہیں ملتے تھے وہ آپ نے پارسال زحمت فرمائے تھے۔ لیکن ان میں خرابی یہ ہے کہ جو سب سے اچھے تھے وہ پھول دے کر تلف ہو گئے۔ آپ نے جتنے بھیجے تھے ان میں گنتی کے دو ایک زندہ ہیں۔ اس لیے اگر آسانی سے ممکن ہوا کرے تو صرف جربیرے کی کچھ اعلیٰ قسمیں بھیج دیا کیجئے۔ آپ کا یہ عطیہ سب سے بھاری ہوگا۔ امید ہے مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۷)

۱۴/ نومبر ذاکر باغ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
زیدی صاحب مکرم! تسلیم

جربیرے کا موسم آ گیا! پارسال آپ نے بڑے منتخب نمونے ارسال فرمائے تھے۔ خیال تھا کہ وہ اس طرح نمو پائیں گے کہ اس سال آپ کو زحمت نہ اٹھانی پڑے گی لیکن ہوا وہی جو اکثر ہوا کرتا ہے۔ یعنی جتنی اچھی قسم ہوتی ہے اتنی ہی موسم کی بے مہری کا شکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ان میں

سے بہت کم باقی رہ گئے ہیں وہ بھی (بہ مشکل تمام)۔ عمدہ اقسام کو شائقین علیحدہ نہیں کرتے اور دام دینے کا سوال ہی نہیں اس کے باوجود ان کو فراہم کرنا بڑا مشکل کام ہے پھر یہ کہ آپ جس احتیاط واہتمام سے بھیجتے ہیں اس میں بھی کچھ کم زیر بار نہ ہوتے ہوں گے۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی اگر ان تمام دشواریوں میں آپ مجھے بھی شریک رکھتے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۸)

یکم رجنوری ۱۹۷۱ء ذاکر باغ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی! تسلیم۔ نوازش نامہ ملا۔ افسوس ضرور ہے کہ میری فرمائش پر آپ نے گزشتہ اکتوبر میں کسی صاحب کی معرفت جربیرے بھیجے لیکن مجھے مل نہ سکے۔ آپ کو ثواب ملا میں شکرگزار ہوا خدا اوراس کے بندے دونوں کی طرف سے اس کی تلافی ہوگئی۔ سودا برا نہیں رہا۔

نوروز کی تہنیت قبول فرمائے۔ محترمہ بیگم صاحبہ کو بھی۔ امید ہے مزاج مع الخیر ہوگا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۹)

۷رجولائی ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زیدی صاحب مکرم تسلیم! پارسل آپ نے جربیرے کے جو پودے بھیجے تھے ان کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہے۔ اس سال بھیجئے تو اس کے لیے کوئی محفوظ طریقہ سوچ رکھئے۔ ایک عزیز نے بتایا کہ دہرہ دون میں جیرنیم Geranium بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میدان میں بھی کہیں کہیں دیکھے گئے لیکن اتنے اچھے نہیں جتنے کہ پہاڑوں پر ہوتے ہیں۔ اگر ان کے بھی کچھ پودے مل سکیں تو ڈبل جربیروں کے ساتھ بھیج دیجئے گا۔ زیدی صاحب مالیوں کو کچھ انعام دینے سے کام چلتا ہو تو کیا ہرج ہے۔ میری طرف سے دے دیجئے۔ چیز تو اچھی اور مستند مل جائے گی۔ مجھے اندیشہ ہے اس خواہش کے پورا کرنے میں آپ کافی زیربار ہوتے ہیں اور مجھے یہ مفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ

سالانہ جزیہ آپ کب تک ادا کرتے رہیں گے اور کیوں!

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۰)

۲۷/جولائی ۱۹۷۱ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی سلامِ شوق، نوازش نامہ ملا۔

تعجب ہے کہ پچھلے سال آپ نے مختلف اصحاب کی معرفت کئی بار جر بیرے کی پود بھیجی لیکن کسی نے مجھ تک نہیں پہنچائی۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں میرے گھر کا پتہ لگانا مشکل نہیں ہے اور یہاں لوگوں کے مکانات بھی دور دور نہیں ہیں اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ان پودوں کو خود لانے یعنی اسی غرض سے علی گڑھ کے سفر کرنے کی ہرگز ہرگز زحمت وزیر باری نہ اٹھائیں جیسا کہ آپ نے عنایت نامہ میں تحریر فرمایا ہے۔ اس سے مجھ کو تکلیف ہوگی کہ ایک نہایت ہی معمولی کام کے لیے ایک شریف شخص کو اتنی تکلیف دی جائے۔ کجا جر بیرے کی پود کجا آپ کا دہرہ دون سے علی گڑھ کا سفر دونوں میں کوئی تناسب نہیں۔ اس لیے اصرار سے عرض کروں گا کہ محض میری فرمائش پوری کرنے کے لیے آپ ہرگز ہرگز تکلیفِ سفر نہ اٹھائیں اس سے مجھے بڑی تکلیف اور شرمندگی ہوگی۔ سب کو دعا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۱)

۱۲/اکتوبر ۱۹۷۱ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زیدی صاحب مکرم

تسلیم! ستمبر گزر گیا اور وہ پودے نہ آسکے اس کا سبب وہ تکلف ہے جو آپ غیر معمولی حد تک ملحوظ رکھتے ہیں۔ یعنی ان پودوں کے حاصل کرنے اور بھیجنے میں جو زحمت اور زیر باری ہوتی ہے اسے میری خاطر برداشت کرتے ہیں۔ پچھلے سال تو جیسا آپ نے تحریر فرمایا تھا تین صاحبوں

کی معرفت پودے بھیجے اور وہ مجھے نہ ملے۔ اس سال آپ نے ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ آپ خود لے کر تشریف لائیں گے لیکن میں نے فی الفور عریضہ بھیج کر اصرار کیا کہ ایسا ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ اب تکلف برطرف جربیرا اور جیرنیم کے پودے وہاں خرید یے اور پارسل سے بذریعہ ریل بھیج دیجیے جو اخراجات ہوں گے وہ میں ادا کردوں گا۔ مجھے اس کی خوشی ہوگی کہ چیز حسبِ دل خواہ مل گئی۔ جربیرا ڈبل ہوسنگل یہاں مل جاتے ہیں۔ اسی طرح جیرنیم بھی عمدہ قسم کے اور تندرست ہوں جو کہ پھول دے جائیں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۲)

سوموار یکم رنومبر ۱۹۷۱ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مشفقی، تسلیم! ۲۹ر کا نوازش نامہ اور جربیرا اور جیرنیم کے تحفے کل اتوار کی صبح کو ایک صاحب پہنچا گئے۔ ان سے ملاقات نہ ہوسکی ورنہ ان کا شکریہ بالمشافہ ادا کرتا۔ کبھی ہو سکے تو آپ پہنچا دیجئے گا۔ یہی پودے آپ نے جس زحمت اور زیرباری سے میرے لیے فراہم کیے ہیں ان کے لیے دل سے سپاس گزار ہوں۔ یہ تحفہ تو آپ کے لیے سالانہ تاوان بن گیا ہے۔ جربیرے کے لیے آپ نے جس پرہیز کی تاکید کی ہے وہ پہلے سے معلوم تھی پودے ہی نہیں جہاں پانی مرے گا وہاں خرابی آئے گی۔ مکرجی صاحب کو میرا بہت بہت غائبانہ شکریہ پہنچائیے۔ ان کے باغ کا چراغ میرے باغ کو روشن کرے ایسا ہی ہے جیسے فارسی کے مشہور شاعر غنیؔ کاشمیری نے کہا ہے، غنی پیرِ کنعاں کے روزِ سیاہ کو دیکھو کہ ان کا نورِ عین زلیخا کی آنکھ کو روشن کرتا ہے!!

آپ سب کو بہت بہت دعا۔ میرے سلام کے مستحق اب آپ جیسے دور تک نہ ملیں گے ورنہ سلام لکھ بھیجا۔ خدا حافظ، ایک بار پھر نوازش کا شکریہ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۲۳)

۳/مارچ ۱۹۷۲ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی، آداب۔ تہنیت نامہ صادر ہوا۔ یادفرمائی اور عزت افزائی کا شکر گزار ہوں۔

آپ نے جیرنیم کے جو پودے بھیجے تھے وہ کامیاب رہے لیکن ابھی ایک دو ہی پھول نکلے ہیں۔ جربیرا البتہ بڑھے نہیں۔ آئے تھے جبھی بہت کمزور تھے بڑی دیکھ بھال سے جاں بر تو ہو سکے لیکن نہ توانائی آئی نہ پھول۔ شاید آئندہ موسم میں چل نکلیں۔ آپ نے کھادوں کا جو نسخہ لکھ کر بھیجا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ میں نے اسے اپنے بھانجہ کے سپرد کر دیا ہے جو باغ کے کرتا دھرتا ہیں۔ سب کو دعا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۴)

دوشنبہ یکم رمئی ۱۹۷۲ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مجی۔ تسلیم! کل صبح ایک صاحب جو یہاں کیمسٹری میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ آپ کا عطیہ جیرنیم اور جربیرا کے بڑے تندرست اور ہرے بھرے پودے دے گئے۔ آپ کے اس کرم کا شکر گزار ہوں۔ آپ اپنے مواقع کبھی نہیں بھولتے۔ دوست داری اور شرافت کی کیسی اچھی مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو فائز المرام رکھے اور متعلقین کو بہ وجوہ مع الخیر۔ آمین!

جو صاحب پودے دلائے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سفید چھال کے یوکلپٹس کے بیج بھی آپ نے بھیجے ہیں کسی وقت پہنچا دیں گے۔ لیکن بیج سے پیڑ اگانے کے لیے کتنی مدت درکار ہوگی۔ کون جیتا ہے...!

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۲۵)

دوشنبہ ۱۴/اگست ۱۹۷۲ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم! سلام شوق۔ جون میں آپ نے جب کرم دیرینہ جر بیرا اور جیر نیم کے جو پودے بھیجے تھے وہ موسم کی تاب نہ لاکر تلف ہو گئے، حالانکہ ان کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔ موجودہ موسم اس کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ یہاں ان کے پھولنے کا زمانہ جاڑے کا آخر ہوتا ہے۔ اگر اس زمانہ میں آپ ان دونوں (جر بیرا اور جیر نیم) کی اعلیٰ قسم جو صرف آپ کے مقامی احباب کے یہاں ملتی ہے بھیج سکیں تو عین کرم ہوگا جیسا کہ ایک نامعلوم مدت سے آپ کرتے آئے ہیں۔ آپ کی زحمت اور زیر باری کا احساس اور شرمندگی دونوں ہے اس لیے کہ ان کی تلافی کی کوئی صورت اب تک نظر نہ آئی اور مشکل یہ ہے کہ آپ نظر آنے بھی نہیں دیتے! امید ہے آپ اسی طرح خوش و خرم ہوں گے اسی طرح آپ کے اعزا اور احباب بھی۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۶)

۹/ستمبر ۱۹۷۲ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سید صاحب مکرم

تسلیم! کیا میرا پچھلا خط آپ کو نہیں ملا جس میں حسب معمول جر بیرا اور جیر نیم کو منتخب قسموں کا تقاضا تھا!!

آپ کو اس کار خیر کے بجالانے میں جتنی زحمت اور زیر باری اٹھانی پڑتی ہے اس کا احساس رکھتے ہوئے ان کی فرمائش کرتے رہنا معمولی اخلاق و عادات کے آدمی کا کام نہیں ہے۔ امید ہے آپ معہ متعلقین مسرور و مع الخیر ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۷)

۲۶ر ستمبر ۱۹۷۲ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مشفقی۔ تسلیم! نوازش نامہ کل ملا۔ شکریہ

پودوں کے احترام اور رکھ رکھاؤ کی جو باتیں لکھی ہیں وہی نہیں ان سے زیادہ بھی ملحوظ رکھی جاتی ہیں لیکن کیا کیجیے دہرہ دون اور علی گڑھ کے سرد و گرم کا فرق کبھی کبھی ہر کوشش کو لا حاصل کر دیتا ہے۔ دعا ہے کہ آپ اور متعلقین خوش و خرم ہوں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۸)

اتوار ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۲ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم۔ سلام شوق! آج صبح حسب معمول دیرینہ جربیرا آپ کا موسم کا خصوصی عطیہ جربیرا مل گیا۔ خوش اور شکر گزار ہوا۔ پودے جائیداد معلوم ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ پھول بہت اچھے آئیں گے۔

امید ہے مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۹)

۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۳ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سید صاحب مکرم۔ تسلیم!

رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے۔

حسب معمول میری سالانہ فرمائش آپ نے پوری فرمادی۔ جربیرے کی پود آج صبح مل گئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔

متعلقین کو دعا پہنچائے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۳۰)

۱۱/اکتوبر ۱۹۷۴ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم۔ تسلیم!

مجھے آپ اور موسم کے پھول پود کی یاد آئی تو معلوم ہوا کہ آپ کا پتہ بھول چکا ہوں! پتہ ہمارے قابو میں آ گیا کوئی بہت بڑی غلطی نہیں ہو گی تو عریضہ گرتا پڑتا پہنچ جائے گا۔

بھیجنے کے طریقے آپ جانتے ہیں میں تو صرف پھولوں کے نام لکھ دیتا ہوں۔ ہو سکے اور کب نہیں ہو سکا ہے تو کسی طرح جربیرا سنگل Single ڈبل نہیں۔ ڈبل یہاں کامیاب نہیں رہتے۔ ۲ بگونیا، ۳ جیرنیم (سنگل)۔ بگونیا ضرور بھیجئے گا اگر مل جائے۔ اس کی فرمائش پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ امید ہے کہ اس مہنگائی اور کرپشن میں بھی آپ آبرو اور عافیت سے ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۳۱)

۲۸/اکتوبر ۱۹۷۴ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی و مشفقی۔ تسلیم!

۲۶/اکتوبر والا نامہ اور پھولوں کی پود۔ دونوں محفوظ اور بروقت مل گئے۔ آپ کے اس دیرینہ کرم کا دل سے شکر گزار ہوں۔

باغ اور پھولوں کا شوق اب میرے بھانجے ڈاکٹر کمال الدین کو منتقل ہو گیا ہے۔ وہی آپ کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اور میں بہت خوش ہوتا ہوں جب وہ یاد دلاتے ہیں اور آپ ہم دونوں کی فرمائش اس خوبی سے اور خلوص سے پوری کر دیتے ہیں جیسی ہم دونوں خود نہ کر پاتے! اس میں آپ کی اہلیہ محترمہ اور بچوں کے شغف کو بھی بڑا دخل ہے جس کا میں احساس کر سکتا ہوں اور خوش

ہوتا ہوں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کا تذکرہ کر دیا۔ مجھے اس کی مزید خوشی ہے کہ مجھے عزیز و محترم رکھنے والوں میں کیسے شریف لوگوں کا اضافہ ہوا۔

امید ہے آپ اور متعلقین بہم وجوہ مع الخیر ہوں گے۔

دعا گو ، رشید احمد صدیقی

(۳۲)

یکم/اپریل ۱۹۷۵ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مشفقی۔ تسلیم والا نامہ مورخہ ۲۶/فروری جس پر ۲۸/مارچ کی مہر لگی ہوئی تھی کل ۳۱ مارچ کو موصول ہوا۔ دل کے دورے سے آپ پر جو گزری اور گزر رہی ہے نیز صاحبزادی سلمہا کی تکالیف کا حال سن کر بڑی پریشانی ہوئی۔ آپ دونوں جس جسمانی اور ذہنی کلفتوں میں مبتلا ہوں گے اس کا اندازہ کون نہیں کر سکتا۔ آج کل فرائض جس قیمت پر اور جیسی نزاکتوں میں رہ کر ادا کیے جاسکتے ہیں اس کی مثال اور شکار آپ ہیں۔ آپ پر قلب کا دورہ اسی محنت شاقہ اور صحت کی طرف سے کلیتاً بے پرواہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ پھر صاحبزادی سلمہا جس حال میں آپ کے قریب ہم وقت صاحب فراش ہوں اس کا بھی میرے نزدیک کچھ اچھا اثر نہ پڑتا ہوگا۔ باپ بیٹی دونوں سخت آزار میں مبتلا ایک دوسرے کے قریب دونوں کے ذہنی سکون کے لیے ساز گار نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ دونوں جلد سے جلد شفایاب ہو کر گھر کو واپس ہوں اور اسپتال کی فضا سے نجات ہو۔

کم و بیش ۲۰ سال ہوئے ہیں میں بھی قلب کے حملہ کا شکار ہوا۔ اس کا جو اثر ہوا اس کا ذکر کچھ ضروری نہیں۔ صرف اتنا عرض کروں گا جہاں تک ممکن ہو محنت اور ذہنی پریشانیوں سے بچا جائے۔ زندگی کے معمولات اعتدال پر رکھے جائیں۔ نیز انڈا، گھی، دودھ، مکھن Animal Fat سے پرہیز کیا جائے۔ اس مرض میں دوا کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنا پرہیز اور اعتدال کی زندگی کو۔

ڈاکٹر کمال الدین سلام عرض کرتے ہیں اور خوش اور شکر گزار ہیں کہ آپ کے بھیجے ہوئے پھولوں کی پود یہاں کامیاب رہی اور باغ کی رونق و ثروت میں ان سے معتد بہ اضافہ ہوا۔ اب تو

بہار کے ختم ہونے کا زمانہ آیا۔ انشاء اللہ اگلے سال آپ کو آپ کے خوبصورت عطیات کی 'حسب معمول' یاد دلائی جائے گی۔ فی الحال تو یہ دعا ہے کہ آپ اور صاحب زادی سلمہا صحت یاب ہو کر مکان واپس ہوں اور احباب و اعزا خوشیاں منائیں۔ کسی صاحب کو ہدایت فرما دیں کہ وہ وقتاً فوقتاً خیریت کا ایک کارڈ بھیج دیا کریں۔ خدا حافظ

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۳۳)

شنبہ ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مشفقی۔ سلام مسنون!

نادم ہوں کہ اب سے پہلے، بہت پہلے خط نہ لکھ سکا۔ اس دوران آپ اور صاحبزادی سلمہا کی خیریت مزاج بھی دریافت نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا آپ دونوں صحت یاب ہو کر اسپتال سے گھر واپس آئے اور معمولات زندگی میں مصروف و منہمک ہو گئے۔ پھولوں کی پود بھی مل گئی۔ آپ کے اس دیرینہ اور سالانہ عطیات کا شکر گزار ہوں۔ ڈبل جربیرا یہاں کامیاب نہیں رہتا۔ جیرنیم البتہ پھولتا پنپتا ہے اور محنت وصول ہو جاتی ہے۔ بگونیا بھی نہیں چلتا۔

امیدوار ہوں کہ دو حرف خیریت مزاج کا لکھ کر بھیج دیں گے۔ خدا حافظ

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۳۴)

۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبّ مکرم تسلیم والا نامہ کئی دن ہوئے صادر ہوا۔ یہ معلوم کر کے کتنی خوشی ہوئی کہ خدا کے فضل سے آپ کی اور نور چشمی سلمہا کی صحت بحال ہے۔ اور روز مرہ کے مشاغل میں مصروف و مسرور گرامی نامہ میں آپ نے جن خیالات اور جذبات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے دل سے سپاس گزار ہوں۔

عزت اور اخلاص کے کیسے کیسے خیالات و جذبات!

اللہ تعالیٰ آپ اور متعلقین کو خوشی اور نیک نامی کی زندگی عطا فرمائے۔ آمین

کمال نے آپ کا خط پڑھ لیا اور آداب بجالائے ہیں۔ خدا حافظ

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۳۵)

۲۰ را کتوبر ۱۹۷۶ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سید صاحب مکرم۔ تسلیم!

کہاں ہیں کس حال میں ہیں؟ صاحبزادی سلمہا کی صحت کیسی ہے وغیرہ......

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ محاذ پر خیر و عافیت ہے۔ حسب معمول آپ کے سالانہ جزیہ یا چوتھ کا مطالبہ کیا جائے!!

مخلص ، رشید احمد صدیقی

■

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے نام

(''رشید احمد صدیقی: افکار و اسالیب'' سے ماخوذ)

(۱)

۱۵/اکتوبر ۱۹۷۱ء

خواجہ صاحب مکرمی تسلیم!

مجھے صبح کی گفتگو کے سلسلے میں ایک تجویز ذہن میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ ''نظام لیکچرز کے چار لیکچروں کا ایک پروگرام چار سال کے لیے کیوں نہ بنا لیجیے۔'' مشترکہ عنوان یہ ہوگا ''اوراقِ مصوّر''

اس میں دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور حیدرآباد کے تہذیبی عوامل و عناصر کا جائزہ ہوگا۔ انگریزی میں اس طرح کہیں گے Cultural Contribution of حیدرآباد کو ترجیح حاصل رہے گی اس لیے کہ ''نظام لیکچرز'' وہیں کا عطیہ ہیں۔ اس پر ہارون خاں شیروانی یا پروفیسر حبیب الرحمٰن بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔ دہلی کو نظامی صاحب کے سپرد کیجیے، پروفیسر کلیم الدین کے حصے میں پٹنہ آئے گا۔ اور لکھنؤ پروفیسر مسعود حسن رضوی کو دیجیے۔ وغیرہ۔ صبح کے مجوزہ حضرات میں پروفیسر کلیم الدین کو بھی رکھ لیجیے۔

مخلص،

رشید احمد صدیقی

پروفیسر محمود الٰہی کے نام

(۱)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۱؍جون ۱۹۵۵ء

مکرمی، تسلیم! گرامی نامہ مورخہ ۹؍جون موصول ہوا، یونیورسٹی وسط جولائی سے کھل رہی ہے۔ آپ اگر یہاں آجائیں تو ضروری امور پر گفتگو ہو جائے گی۔ آپ کا داخلہ پی ایچ ڈی کے لیے کچھ اتنا مشکل نہیں لیکن کیا موضوع ہوگا کیا طریقۂ کار ہوگا Synopsis کیا ہوگی نیز اسکالرشپ کا مسئلہ یہ سب امور زبانی گفتگو کے بعد طے پاسکیں گے۔ اس لیے آپ کو جب کبھی سہولت ہو دو ایک دن کے لیے علی گڑھ تشریف لائیے۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۲)

یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۷؍جون ۱۹۵۵ء

مکرمی، سلام مسنون

والا نامہ مورخہ ۱۵؍جون ملا۔ ۱۵؍جولائی کے بعد آپ جب آجائیں گے گفتگو ہو جائے گی جب یہاں داخلہ ہو جائے اس وقت رخصت کی درخواست دیں۔ داخلہ کے مراحل طے ہونے میں کچھ دیر لگتی ہے کیا ہرج اگر آپ یکم ستمبر سے رخصت لیں اسی ماہ میں امید ہے کہ داخلے کے مراحل طے ہو جائیں گے۔ جواب حاصل کرنے کے لیے ٹکٹ یا لفافہ بھیجنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۳)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۱؍جولائی ۱۹۵۵ء

محترمی! گرامی نامہ مورخہ ۹؍صادر ہوا۔ میں انشاءاللہ ۱۶؍کو دوپہر میں مل سکوں گا۔ اطلاعاً عرض ہے۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۴)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۰؍مئی ۱۹۵۶ء

محمود الٰہی صاحب۔ مکرم، سلام مسنون، کل والا نامہ سے خیریت معلوم ہوئی۔ غالباً یہ خط آپ کو پرسوں ملے گا۔ اس طور پر عید کی تہنیت بھی قبول فرمایئے۔ قیاس ہے کہ عید ۱۲ کو ہوگی۔ دیکھتے دیکھتے ایک سال کی مدت ختم ہوئی۔ آپ کو اپنے کل پر نظر رکھنا چاہیے۔ دو سال کے اندر اندر پی ایچ ڈی کا مقالہ ختم کر دینا چاہیے۔ پابندی سے کام کیا جائے تو ایسا کچھ دشوار نہیں ہے۔

یاد آتا ہے آپ نے دبی زبان سے ایک دوٹانڈہ کی مصنوعات کسی ایک کے بارے میں فرمایا تھا کہ میں قبول کرلوں گا یا نہیں وہ واقعہ اس وقت یاد آ گیا۔ اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ سے ایک بار پھر عرض کردوں کہ میں طالب علموں سے تحائف نہیں لیتا اس سے بعض شاگردوں کو مایوسی ہوئی لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا۔ میرے لیے یہ بہت کافی ہے کہ طلبا میرا خیال رکھتے ہیں۔ یہ سب سے بڑا انعام ہے جو میں بڑی خوشی سے قبول کر لیتا ہوں۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۵)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۴؍مئی ۱۹۵۷ء

مکرمی! سلام مسنون۔ آپ کے دونوں خطوط ملے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ مع

الخیر ہیں اور کام بخیر وخوبی انجام پارہا ہے۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۶)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۴/اپریل ۱۹۵۸ء

سروری صاحب کا خط آ گیا۔ انہوں نے رپورٹ بھیجی ہے۔ اب کل یونیورسٹی جا کر دیکھوں گا کہ کیا کارروائی باقی ہے۔ خلیل صاحب کو آپ کا کام سپرد کر دوں گا۔

خیر طلب

رشید احمد صدیقی

(۷)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۷/اپریل ۱۹۵۸ء

محمود الٰہی صاحب مکرم! تسلیم

ڈاکٹر محمد حسن صاحب دفعتاً رخصت پر ۲۶ تک کے لیے مراد آباد چلے گئے۔ اب غالباً وہ ۲۸ کو یہاں ہوں گے۔ اس طرح سے ایک طور پر ۲۴ یا ۲۶ کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ میں نے پروفیسر مسعود حسن صاحب اور ڈاکٹر محمد حسن صاحب دونوں کو لکھ دیا ہے کہ وہ کوئی تاریخ مقرر کر کے مجھے اطلاع دے دیں۔ موخرالذکر سے یہ بھی درخواست کی ہے کہ جو تاریخ مقرر ہو اس سے براہِ راست آپ کو مطلع کر دیں۔ چنانچہ اب Viva کی تاریخ کا دارومدار تمام تر اس تاریخ پر ہے جو ڈاکٹر حسن اور پروفیسر رضوی مقرر فرمائیں گے۔ آپ حسب ذیل پتہ پر ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ بتوسط منشی الطاف حسین صاحب، محلّہ نواب پورہ، مراد آباد۔

خیر طلب

رشید احمد صدیقی

(۸)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۷/اپریل ۱۹۵۸ء

محمود الٰہی صاحب، سلام مسنون

آپ کا ۱۵/ کا لفافہ آج ۵ بجے شام ملا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب کو لکھا گیا ہے کہ ۲۴ یا ۲۶ کو کوئی وقت مقرر فرمائیں۔ یہ اس لیے کہ وہ ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر ہیں اور کونسل کی میٹنگ ۲۵/اپریل کو ہو رہی ہے۔ اس لیے قیاس یہ ہے کہ اسی ہلّے میں امتحان کی اس مہم کو نپٹا دینا چاہیں گے۔ موصوف کے خط کا انتظار ہے ممکن ہے وہ کوئی اور تاریخ مقرر کریں لیکن اس کا گمان کم ہے۔ تاریخ معلوم ہونے پر آپ کو اطلاع دی جائے گی۔ مطمئن رہیے۔

خیر طلب

رشید احمد صدیقی

(۹)

یونیورسٹی علی گڑھ

۲۲/اپریل ۱۹۵۸ء

محمود الٰہی صاحب مکرم تسلیم!

آج مسعود صاحب کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ اس سیشن میں یہاں آنے سے معذور ہیں۔ میں نے اس کی اطلاع ڈین صاحب کو دے دی ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ امتحان اب آئندہ سیشن میں ہوگا۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۱۰)

۲۹/مئی ۱۹۵۸ء

محمود الٰہی صاحب مکرم تسلیم!

نامۂ گرامی صادر ہوا۔ یاد فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ اور میرے مضامین کی فراہمی پر ہاتھ

بتانے پر آپ نے جس آمادگی کا اظہار کیا ہے اس سے اور زیادہ خوشی ہوئی لیکن یہ ایسا کچھ ارادہ ہے نہیں۔ مضامین تو ایک حد تک فراہم ہو چکے ہیں۔ دو تین سال ہوئے اس بارے میں آپ نے مدد بھی فرمائی تھی۔ سب سے زیادہ مشکل یہ درپیش ہے کہ ان پر نظر ثانی کیونکر کی جائے۔ اور انتخاب کے مراحل کیوں کر طے ہوں۔ وغیرہ۔

امید ہے آپ خوش اور مست ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۱)

یونیورسٹی علی گڑھ

۱۶/دسمبر ۱۹۵۸ء

محمود الٰہی صاحب مکرم سلام مسنون!

خط ملا۔ میرے لیے آپ نے جن جذباتِ عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کا شکر گزار ہوں لیکن آپ کی طرف سے مجھے ان کا علم ویقین آج سے بہت پہلے سے تھا! البتہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھئے کہ ہر خوشی اور فخر اپنے ساتھ بڑی ذمہ داری لاتا ہے۔ یعنی جس حسنِ سلوک سے آپ کو جو فائدہ پہنچا ہے۔ کوشش کیجیے کہ آپ کے حسنِ سلوک سے وہی فائدہ دوسرے مستحقین کو پہنچے۔ زکوٰۃ روپے پیسے، مالِ معیشت ہی پر واجب نہیں آتی۔ عزت اور فراغت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس نکتہ کو کبھی نہ بھلایئے گا۔ خدا آپ کا حافظ و ناصر رہے۔ آمین!

طالبِ خیر ، رشید احمد صدیقی

(۱۲)

۲۳/جنوری ۱۹۶۰ء

ذکاءاللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم سلام مسنون!

خط ملا۔ آپ کے خیریت نامہ میں مستعدی اور نیک نامی کا حال سن کر خوش ہوا۔ مخالفت کا غم نہ کیجیے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ کام میں مستعدی اور بڑھا دیجیے۔ آپ خود کسی کے درپہ نہ ہوں

جہاں تک بن پڑے سب کے خیر اندیش رہیے۔ اس سے دشمن دوست بن جاتے ہیں آج نہیں تو کل۔ اور نہ بھی بنیں تب بھی آپ کا احترام کریں گے۔ یہ نتیجہ بہت معمولی ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت دشوار ہے تاوقتیکہ تائیدِ الٰہی شامل حال نہ ہو۔ اس کی دعاء کرتے رہیے۔ میں بھی کرتا رہوں گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۱۳)

۲۶ر فروری ۱۹۶۰ء

ذکاء اللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم سلام مسنون!

خط ملا۔ اس کی بڑی خوشی ہے کہ آپ کام محنت اور شوق سے کر رہے ہیں اور اس کے نتائج بھی حسبِ دل خواہ ہیں یعنی جن لوگوں نے موجودہ ذمہ داری آپ کے سپرد کی ہے وہ آپ کے کام سے مطمئن ہیں اور جن کے لیے یہ ذمہ داری تفویض کی گئی ہے وہ بھی آپ سے ارادت رکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ اچھا اور قابلِ اعتبار وہ شخص ہے جس کا خوشی کا پیمانہ جلد اور صبر وتحمل کا پیمانہ کبھی لبریز نہ ہوتا ہو۔ میری دعا ہے کہ آپ ایسے ہی ہو جائیں دشمن اور عیب چیں کہاں نہیں ہوتے اور کس کے نہیں ہوتے؟ ان کی وجہ سے خود کسی کا دشمن یا عیب چیں نہ ہونا چاہیے۔ ایسا کرنا شکست کی علامت ہے، جس سے دشمن خوش ہوتا ہے۔ آپ تو اللہ پر بھروسہ کر کے کام کیے جایئے اس سے آپ کو وہ اعتماد اور وہ قوت حاصل ہوگی جو ہر حال میں آپ کی معین ومعاون رہے گی۔ اِن شاء اللہ!

آپ کے مجوزہ اردو میگزین کے لیے کچھ ہو سکا تو لکھ بھیجوں گا لیکن انتظار نہ کیجیے گا۔ اس لیے کہ کچھ کر نہ پایا تو مجھے شرمندگی اور آپ کو مایوسی ہوگی۔

خیر طلب

رشید احمد صدیقی

(۱۴)

۱۹ر مئی ۱۹۶۰ء

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مشفقی، سلامِ شوق!

خط ملا۔ آپ جو خدمات مجھ سے لینا چاہتے ہیں، ایسا ہوتا کہ میں ان کو پوری کرسکتا عزیزوں کی فرمائش پوری کرتا، کیسے کہوں آپ نہ چاہتے ہوں گے کہ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ علی گڑھ سے باہر جانے کی نہ سکت نہ خواہش۔ آپ تو ان کاموں کے لیے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا انتخاب کریں وہ جولائی میں امریکہ سے آجائیں گے۔ وہ ہر اعتبار سے آپ کے مفید ہوں گے۔ ایسا نہ ہوتا تو اس وثوق سے نہ کہتا۔ فنی کمالات کے علاوہ ان میں شخصی خوبیاں بھی ایسی ہیں جو دوسروں میں شاید ہی یکجا ملیں کچھ اور ہیں تو ماہر لسانیات ہونے کے اعتبار سے ہندوستان میں دور دور ایسا شخص نہ ملے گا۔ آپ کا مضمون ہماری زبان میں نظر سے گزرا۔ بہت اچھا تھا۔

شرفائے ادب کا یہی لب ولہجہ ہوتا ہے اور علمی مباحث پر اسی طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔ والدین کا سفر بیت اللہ مبارک ہو۔

خدا!! ارض شرف وسعادت سے ان کو تندرست اور خوش وخرم لائے اور آپ ان کی دعاؤں اور شفقت سے تا دیر بہرہ مندرہیں۔

دعاگو ، رشید احمد صدیقی

(۱۵)

۳ر اگست ۱۹۶۰ء

ذکاءاللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم سلام شوق

نوازش نامہ ملا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب وسط جولائی میں امریکہ سے مع الخیر واپس آگئے۔ ملاقات ہوئی تو آپ کی فرمائش کا ذکر کردوں گا، لیکن آپ یقین رکھیں۔ نومبر میں وہ ماڈریشن میں جاسکیں گے اور مارچ میں زبانی امتحان لینے بھی۔ یہ آپ کا انتخاب مناسب وموزوں

ہے۔ موصوف آپ کے شعبہ کے لیے ہر اعتبار سے مفید ہوں گے۔ ان سے براہِ راست بھی خط وکتابت کر لیجئے۔ ہماری زبان میں آپ اور مجنوں صاحب کی تحریریں برابر نظر سے گزرتی ہیں۔ مجھے موضوع بحث سے زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن اس کی بڑی خوشی ہے کہ گفتگو میں آپ نے وہ آداب نبھائے جو یونیورسٹی کے اساتذہ کا ہوتا ہے۔ اس بارے میں دوسرے بھی میرے ہم خیال ہوئے۔ اس پر آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے آپ ہمیشہ تلاش و تحقیق کا یہی معیار اور گفتگو کا یہی انداز ملحوظ رکھا کریں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۶)

۳۱ را کتوبر ۱۹۶۰ء

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم تسلیم!

عنایت نامہ ملا۔ مسعود صاحب کو میں نے اطلاع دے دی ہے۔ یقین ہے وہ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ وہاں پہنچیں تو ان سے درخواست کیجئے گا کہ آپ کے طلبا کو کسی ادبی موضوع پر خطاب بھی کریں۔

اس سے آپ سب بہت خوش ہوں گے۔ اس طرح کی تقریب اس نواح میں کم سننے میں آئے گی اس لیے یہ مشورہ دے رہا ہوں۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۱۷)

۱۴ ر نومبر ۱۹۶۰ء

یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم تسلیم!

خط ملا۔ مسعود صاحب سے میری بات ہو چکی ہے وہ ۲۷ کو انشاءاللہ وہاں پہنچیں گے اور وہ سارے پروگرام پورے کریں گے جو آپ چاہیں گے۔ البتہ ان کے اس خیال سے مجھے اتفاق ہے

کہ یہ مسعود صاحب پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ کہاں قیام کریں گے۔ اگر وہ آپ کے یہاں کے بجائے کہیں اور قیام کرنا مناسب سمجھتے ہوں تو آپ اصرار نہ کریں وہیں ٹھہرنے دیں۔ مصلحت یہی ہے۔

اگر آپ مشاعرے کی کوئی صحبت منعقد کرنا چاہیں گے تو وہ بھی کر لیجیے گا اور مسعود صاحب سے اصرار کیجیے گا کہ اپنا کلام سنائیں۔ ان کے کلام سے ہندی والے بھی متاثر اور محظوظ ہوں گے

آپ کا ، رشید احمد صدیقی

(۱۸)

۲ ردسمبر ۱۹۶۰ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم سلام مسنون!

مسعود صاحب آئے اور ملے، گورکھپور کے سفر کی روداد سنائی۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ وہ اتنے خوش اور مطمئن آئے جتنے کی توقع تھی اور جس کی تصدیق آپ نے اپنے خط میں کی ہے وہ اس کی بڑی تعریف کر رہے تھے کہ آپ اور آپ کے رفقاء شعبہ کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لا رہے ہیں۔ اس سے بھی خوش تھے کہ آپ نے لائبریری اچھی بنالی ہے اور ضروری اور اچھی کتابوں کا برابر اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

بس کام کیے جائیے۔ جس کا انعام آپ کو اپنے طالب علموں سے ملے گا۔ جس سے بڑا انعام معلّم کے لیے دوسرا نہیں۔ نہ اپنا دربار بنائیے اور نہ کسی دوسرے کے دربار سے تعلق رکھیے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۱۹)

۱۰ ر ستمبر ۱۹۶۲ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مشفقی تسلیم، نوازش نامہ ملا۔

بہت دنوں بعد آپ کی خیریت معلوم ہوئی! مسعود صاحب یہاں تھے تو گورکھپور جایا کرتے تھے اور حالات معلوم ہو جایا کرتے۔ اب وہ پروفیسر ہو کر عثمانیہ یونیورسٹی چلے گئے۔

مجھے گورکھپور آنے کی دعوت دے کر آپ نے لطف و کرم کا اظہار کیا جس سے خوش بھی ہوا اور شکر گزار بھی۔ لیکن اب میں کہاں اور اس طرح کے سیر و سفر کہاں، البتہ دعا کرتا ہوں کہ خواص و قابل نوجوان مجھ سے اچھے کارنامے انجام دیں، نامور ہوں۔ کئی مہینے ہوئے یہ خبر ملی تھی کہ اپنی کسی کتاب پر حکومت یوپی سے کوئی انعام ملا ہے۔ لیکن اس کے بعد کوئی باضابطہ تصدیق نہ ہوئی اور میں نے سمجھا کہ وہ بات آئی گئی۔ آپ کے کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے خبر صحیح ہو۔ اپنے بارے میں آپ نے کچھ نہیں لکھا کہ شعبہ کا کام کیسا ہو رہا ہے دوست اور دشمن کس طرح پیش آتے ہیں دعا ہے کہ خیریت ہو لیکن آپ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہیں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۰)

۱۴؍نومبر ۱۹۶۲ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مشفقی، تسلیم!

مجھے رجسٹرشدہ مضمون مل گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اپنی بیگم صاحبہ کی علالت کے سبب سے ان دنوں لکھنؤ آتے جاتے رہتے ہیں موصوف جب آئیں گے آپ کا مضمون حوالہ کر دیا جائے گا۔ اور امید ہے کہ فکر و نظر کے آئندہ شمارے میں شائع ہو جائے گا۔ ممکن ہے آج ہی کل میں واپس آتے ہوں۔ آپ نے عنایت نامے میں جن دوسری باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ حتی الوسع ضرور کروں گا بشرطیکہ جن پریشانیوں میں مبتلا ہوں ان سے یکسو ہونے کا موقع مل جائے جس کی کم ہی امید ہے بہر حال۔ جو خدا کی مرضی ہے وہ ہوگی۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۱)

۲۲؍دسمبر ۱۹۶۲ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم سلام شوق!

گرامی نامہ ملا ۲۰ کا۔ مجھے وہ معاوضۂ امتحان کا چیک بہت دن ہوئے مل گیا۔ اپنا مقالہ بھی شائع کرائیے اس پر بطور تعارف کچھ کہنے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اول تو یہ نہیں معلوم کہ اس طرح کے مقالے لائبریری کے ارباب آسانی سے کسی کو دے بھی دیتے ہیں یا نہیں اگر اس کے لیے اردو ڈپارٹمنٹ وغیرہ کی رضامندی حاصل کرنی پڑی تو میں اس پر اپنے کو آمادہ نہ کرسکوں گا۔ دوسرے یہ کہ ان دنوں طبیعت اچھی نہیں لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی لیکن آپ کی یہ فرمائش ذہن میں رہے گی۔ اگر کچھ کرسکا تو کروں گا۔ البتہ اس وعدے پر مطمئن نہ ہو جائیے گا۔ معلوم نہیں کام کرسکوں یا نہیں۔

امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے اور خوش و خرم۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۲۲)

۳ر جنوری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محبی و مشفقی تسلیم!

والا نامہ موصول ہوا۔ آپ کے مقالے کے بارے میں دیکھوں گا کہ کیا کرسکتا ہوں۔ ہوسکا تو ضرور کچھ کروں گا۔ مہدی افادی کے خطوط کی طباعت، اشاعت ضرور کیجئے۔ اب رہا یہ کہ ان کی خانگی زندگی میں کیا نزاکتیں ملتی ہیں اور ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے اس کے بارے میں کیا عرض کروں۔ سوا اس کے کہ جہاں نزاکت کا احساس ہو وہاں یا تو قدم نہ رکے یا سرسری گزر جائے مگر جہاں تک آپ نے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ کچھ ایسے دشوار گزار مراحل معلوم نہیں ہوتے۔ تفصیل کے بجائے صرف اشارہ یا تذکرہ کر دیجئے اور ایسا کرنا آپ یقیناً جانتے ہیں۔

نئے سال کی تہنیت قبول فرمائیے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۲۳)

۱۸ر جنوری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محبی تسلیم!

فضل صاحب کا تہنیت کا ایک تار مجھے موصول ہوا۔ مجھے موصوف کا صحیح پتہ نہیں معلوم اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا شکریہ ان تک پہنچا دیجیے۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا ورنہ میں براہِ راست شکریے کا خط لکھتا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۴)

۳۰ر جنوری ۱۹۶۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مشفقی تسلیم!

تہنیت کا گرامی نامہ موصول ہوا آپ کے کرم کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس موقع پر یاد رکھا۔ آپ نے جس اسکیم کا ذکر کیا ہے وہ تو یونیورسٹی کے غور کرنے کی چیز ہے۔ اس میں میرا یا آپ کا کیا دخل! چھوڑیئے اس قصے کو "ہورہے گا کچھ نہ کچھ" پھر مجھے کیا مطلب؟

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۵)

۱۱ر جولائی ۱۹۶۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب قبلہ تسلیم!

مجھے ہمدرد دواخانہ دہلی کا بھیجا ہوا ایک بوتل شہد ڈاک سے موصول ہوا آپ نے اس بارے میں پہلے سے کچھ نہیں اطلاع دی تھی اس لیے دیر تک سوچتا رہا کہ آپ ہی نے بھیجا تھا یا کسی اور نے اور کیوں؟

اگر آپ نے یہ زحمت اور زیر باری گوارا فرمائی تو آخر کیوں؟ یقیناً یہ آپ کی محبت اور کرم ہے کہ آپ نے ایسا کیا اور اس تحفے کا تہہ دل سے شکر گزار بھی ہوں لیکن یہ زیر باری کیوں اور وہ بھی میرے لیے۔ بہر حال اس نفیس تحفہ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور کیا کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

دعا ہے کہ آپ اچھے ہوں گے، یونیورسٹی کھل گئی ہوگی اور آپ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مسرور اور مصروف ہوں گے۔

دعا گو ، رشید احمد صدیقی

(۲۶)

۱۷/ جولائی ۱۹۶۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر صاحب قبلہ تسلیم!

میرا پچھلا کارڈ آپ کو ملا ہوگا۔ جس میں شہد پانے کا آپ کا شکریہ ادا کیا تھا اب معلوم ہوا کہ یہ ہمدرد دواخانہ کے کوئی اور صاحب تھے جنہوں نے ایک دوسرے صاحب کی فرمائش پر بھیجا تھا۔

اگر پارسل کے اندر کوئی خط رکھ دیا ہوتا تو صورت حال ایسی مضحکہ خیز نہ ہوتی۔ اس ایک غلط کارروائی سے مجھے یہ چار خط مختلف اصحاب کو لکھنے پڑے کسی کو معذرت کا کسی کو ندامت کا اور کسی کو شکریہ کا۔ دنیا میں کیسے کیسے عقلمندوں سے سابقہ پڑتا ہے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۷)

۲۵/ جولائی ۱۹۶۳ء

یونیورسٹی علی گڑھ

محبی تسلیم!

آپ کا ۲۳/ کا خط مجھے ملا۔ آپ کی پریشانی اور بچے کی علالت کا حال سن کر مضطرب ہوا۔ بچے کی شدید اور طویل علالت کا والدین پر کیا اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ بخوبی کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اضطراب کو اطمینان سے بدل دے اس کی دعا کرتا ہوں۔ خدا بچے کو کلی صحت عطا فرمائے

تو مجھے مطلع فرما دیجیے گا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۸)

۲/ اگست ۱۹۶۳ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی سلام مسنون!

یہ معلوم کر کے خوشی اور اطمینان ہوا کہ صاحبزادے کی رفتار صحت سے آپ مطمئن ہیں۔اللہ تعالیٰ جلد مکمل طور پر صحت یاب کر دے۔ آمین!

جی ہاں، عارضی طور پر ایک سال کے لیے ڈاکٹر محمد حسن صاحب ریڈر ہو کر چلے گئے۔ دہلی یونیورسٹی میں تقرر ہوا ہے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲۹)

۱۹/ اکتوبر ۱۹۶۳ء

مکرمی تسلیم!

عنایت نامہ ابھی ابھی ملا۔ آپ نے جن صاحب کی ممتحنی کے لیے سفارش کی ہے وہ ٹھیک ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ ۱۳/ ماہ اکتوبر کو طے ہو گئی۔ آپ نے پانچ سات دن کی دیر کر دی۔ نام درج کر لیا جائے گا۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ آپ کے بچے کا حال سن کر تردد ہوا۔ اللہ تعالیٰ شفا بخشے۔ کیا ہرج اگر چند دنوں کے لیے اسے لکھنؤ لے جا کر میڈیکل کالج میں دکھایئے وہ پورے طور پر Cheek Up کر کے کوئی تدبیر نکالیں گے۔ جانے کا قصد ہو تو لکھئے گا میں ایک خط اپنے ایک مکرم ڈاکٹر فریدی صاحب کو لکھ دوں گا۔ وہ بڑی توجہ اور ہمدردی سے دیکھ لیں گے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۳۰)

۲۸/اکتوبر۱۹۶۳ء
یونیورسٹی علی گڑھ

محترمی تسلیم! عنایت نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب یہاں نہیں ہیں دہلی ہیں۔ ان کا پتہ غالباً یہ ہے۔ (پروفیسر محمد حسن ۱۲۳ جبلی ہاسٹل، دہلی یونیورسٹی، دہلی-۶) اس پر اطلاع دے دیجئے۔ ضابطہ سے آپ کا اطلاع بھیجنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بچے کو شفا دے۔ آمین!

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

(۳۱)

۱۱/نومبر۱۹۶۳ء
یونیورسٹی علی گڑھ

محبی تسلیم! ۷/نومبر کا نوازش نامہ پرسوں ملا تھا۔ کیسی خوشی ہوئی آپ کے بچے کی صحت یابی کی خبر سن کر! ماں باپ کس کس طرح شادمان اور اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہوں۔ اللہ مبارک فرمائے۔ مذکورہ دلّی کالج میگزین مجھے نہیں ملی۔ ممکن ہے آیا ہو اور ادھر ادھر ہو گیا ہو۔ لکھنے پر لوگ اتنا اصرار کرتے ہیں اور معذوریوں پر دھیان نہیں دھرتے کہ بعض اوقات بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ شائلاک کی طرح پاونڈ آف فلش پر اصرار کرنا شریفوں کو زیب نہیں دیتا لیکن کیا کیجئے کہ کہنا ماننا ہی پڑتا ہے۔ بہر حال اطمینان ہوا کہ جو کچھ میگزین کے لیے لکھ دیا تھا وہ آپ نے پسند کیا۔ اب تو یاد بھی نہیں رہا کہ کیا لکھا تھا۔ سب کو دعا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

(۳۲)

۲۳؍نومبر ۱۹۶۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی و مشفقی تسلیم! نوازش نامہ ملا۔ امتحان کے معاوضے کے بارے میں زیادہ کاوش نہ کیجئے وقت پر آجائے گا۔ مجھے یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ ایسا تو نہیں کہ مل چکا ہو۔ آپ کے کہنے سے یہ شبہ دور ہو گیا۔ اس سال بھی محصولہ آخر موصول ہو گیا اور میں نے ہمروزہ مکمل کر کے بھیج بھی دیا۔ رسید بھی آگئی۔ اس کا مزید شکر یہ کہ کام بڑا آسان تھا۔ فکر و نظر کے ایڈیٹر پروفیسر نذیر صاحب اپنی اہلیہ اور صاحبزادے کی علالت کے سلسلے میں لکھنؤ گئے ہوئے ہیں۔ عنقریب واپس آئیں گے تو آپ کا مضمون حوالہ کر دوں گا۔ آپ گورکھپور کے ان اکابر پر کیوں نہ کچھ لکھ دیں جن کی ایک زمانے میں اردو شعر و ادب میں بڑی شہرت تھی مثلاً حکیم برہم مدیر مشرق، ریاض اور ان کا فتنہ مہدی افادی، سبحان اللہ خاں مرحوم اور ان کی علم دوستی، اس طرح یہ آپ گورکھپور کا حق ادا کر دیں گے جو آپ پر واجب ہو گیا ہے۔ علی گڑھ کے بارے میں اس عہد کے اخباروں نے محصولہ کیفیتوں سے خط کتابت کا کھوج لگائے جو علی گڑھ تحریک یا اس کے بانی سے واقف تھے اور جنہوں نے ان کے بارے میں کچھ لکھا ہو۔ ہر چیز نئی ہوگی۔ اس بارے میں لکھنؤ کا ''اودھ پنچ'' اور پنجاب کے بعض اخبارات مفید مطلب ہوں گے۔ پنجاب کا سرسید نے کافی دورہ کیا تھا ممکن ہے وہاں کے اس زمانے کے اخبارات میں مفید مطلب موادل سکے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۳۳)

دوشنبہ ۳؍جنوری ۱۹۶۴ء

یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر صاحب، مکرم تسلیم! مجھے تو معلوم نہ تھا کہ آپ کی یونیورسٹی سے امتحان کا معاوضہ موصول ہوا یا نہیں۔ ایک ماہ سے اوپر ہوا۔ اکاؤنٹ آفس کا خط آیا کہ بل کا پتہ نہیں لگتا دوسرا بھیجا

جانا ہے اس پر دستخط کر کے بھیج دیں تا کہ معاوضہ ادا کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ دستخط کر کے بھیج دیا گیا۔ کچھ دن ہوئے اس کی یاددہانی بھیجی کوئی جواب نہ آیا۔ ممکن ہے دوسرا بل بھی ادھر ادھر ہو گیا ہو۔ اب آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۳۴)

۸/فروری ۱۹۶۴ء

یونیورسٹی علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب، مکرم تسلیم!

ابھی ابھی آپ کا کارڈ ملا۔ اس سے پہلے کا بھی مل چکا ہے جس میں آپ نے بچے کی علالت اور جامعہ سے معاوضۂ امتحان کی ادائیگی کے بارے میں تحریر فرمایا تھا۔ جامعہ والوں کو اسی دن لکھ دیا کہ نتیجہ کے شائع ہونے نہ ہونے کا انتظار نہ کیا جائے۔ معاوضہ فی الفور ادا کر دیا جائے۔

امید ہے کہ بہت جلد اس کا انتظام ہو جائے گا۔ بچے کی علالت سے البتہ پریشانی ہوئی۔ اس کی صحت یابی کی خبر سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی بے قراری دور کرے اور بچہ صحت یاب ہو کر والدین کی شکر گزاری اور شادمانی کا باعث ہو، آمین۔ چیک دفتر سے آجائے گا۔ زیادہ تردد نہ کیجئے۔ دفتروں کی ابتری ہر جگہ یکساں ہے۔ ابھی دفتر سے اطلاع ملی کی اس وقت اس مد میں روپیہ نہیں ہے۔ بہر حال دیکھوں گا کہ کیا ہو سکتا ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۳۵)

۷/مارچ ۱۹۶۴ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم! سلام مسنون

۴/مارچ کا گرامی نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ سب سے زیادہ تردد اور انتظار تو آپ کے لڑکے کی

علالت اور صحت کی طرف سے تھا اس کا آپ نے کچھ حال نہ لکھا۔ لیکن نہ لکھنے سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ بفضلہٖ تعالیٰ بہتر ہے اور بچے کی صحت عود کررہی ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، مجھے آپ گورکھپور بلا کر کیا کیجئے گا۔ کچھ ایسے جبر میں آ گیا کہ دہلی جانا ہی پڑا۔ ورنہ اس طرح کی باتوں سے اب دل سیر ہو چکا ہے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۳۶)

۱۷/مارچ ۱۹۶۴ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم سلام مسنون! کل آپ کی یونیورسٹی سے معاوضہ امتحان کا ایک چیک ۸۵روپے کا موصول ہوا۔ حالانکہ ہونے چاہیے تھے ۱۰۰روپے۔ ورنہ کم سے کم ۹۵روپے۔ تفصیل یوں ہے۔ پرچے کے ۷۵روپے۔ فی امیدوار یا کاپی ۲روپے کل امیدوار ۱۰ تھے۔ اس طرح ۹۵روپے ۵۰روپے پرچے کو بذریعہ بیمہ بھیجنے کے۔ ۱۰ کاپیوں کا محصول ڈاک جو بذریعہ رجسٹری بھیجی گئی بل اور رپورٹ بھی بذریعہ رجسٹری بھیجے گئے۔ جملہ ۵روپے پرچہ ۱۳نومبر ۱۹۶۳ء کو بھیجا گیا۔ امتحان غالباً مارچ ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ بل معاوضہ مارچ ۱۹۶۴ء میں ادا کیا جارہا ہے۔ وہ بھی ناقص و نامکمل رجسٹرار صاحب کو براہِ راست لکھنے کا جی نہ چاہا۔ آپ کو لکھتا ہوں۔ کبھی فرصت ہو تو آفس جا کر اس کی تصدیق فرما لیجئے گا کہ کتنے امیدوار شریک ہوئے تھے۔ پھر ضروری Contengency وغیرہ کی ادائیگی۔ معلوم نہیں کیسے وہاں آفس والوں نے بل غائب کر دیے۔ اب جو ادا کرنے کی توفیق ہوئی تو یہ حال ہے۔ بہرحال تصدیق فرما لیجئے گا۔ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۳۷)

۱۹/مارچ ۱۹۶۴ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام مسنون!

۶/مارچ کا سرنامہ ابھی موصول ہوا بچہ کا حال سن کر کچھ اطمینان ہوا۔ اللہ شفائے کامل عطا

فرمائے آمین۔ کتنے دن سے معصوم کیسی علالت میں مبتلا ہے۔اس کے ساتھ ماں باپ بھی۔ایسا حال ہوتو گھریلوزندگی کا کیسانظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔آپ نے ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کسی طرح بھی گورکھپور آکر آپ کی میٹنگ میں شرکت کروں۔لیکن مجھے حاضری کی توفیق نہیں ہوتی۔

کیا کروں اب یہی تقدیر میں ہے ورنہ کون ہے جو نہ چاہے گا۔ مسلسل چند مہینوں سے چھوٹے،عزیز دوستوں کی صحبت اٹھائے اور فرمائش پوری کردینے کی خوشی حاصل کرے لیکن کیا کروں کہ اب اس طرح کی باتوں میں جی نہیں لگتا۔دوست احباب بلاتے ہیں تو اسی سے دل خوش ہوتا ہے۔جانتا ہوں کہ تعمیل نہ کرسکوں گا جب بھی وہ برا نہ مانیں گے اور مجھے زحمت نہ اٹھانی پڑے گی۔

آپ کا ، رشید احمد صدیقی

(۳۸)

یکم اپریل ۱۹۶۴ء

یونیورسٹی،علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم،سلام مسنون!

عنایت نامہ موصول ہوا۔جامعہ اردو سے آپ کا معاوضہ امتحان اب تک نہ جاسکا۔بینک اور ڈاک خانہ کے حالات ناموں کے 'داخل خارج' کے ایسے ایسے نشیب وفراز پیش آرہے ہیں کہ کچھ کہتے نہیں بنتی۔مرحوم علوی صاحب کے نام رہا ہے۔روپیہ ان کی منصبی حیثیت سے جمع ہے یا ذاتی حیثیت سے اس طرح کی قانونی موشگافیاں ہیں جس کی وجہ سے عملے کی تنخواہ بھی اکثر کھٹائی میں پڑجاتی ہے۔لیکن کوشش برابر جاری ہے کہ کسی طرح ہر چیز منقح ہوجائے۔آپ کے معاوضہ کا جلد انتظام کیا جاسکے۔گورکھپور یونیورسٹی کی یہ بڑی زیادتی ہے کہ وہ اپنے عملے کی نالائقی پر غور نہیں کرتی۔ممتحنوں کے معاوضوں کی قطع برید کرنے پر تیار ہوجاتی ہے۔میں نے پرچہ دوسرے دن بنا کر بھیج دیا تھا۔جس کی رسید میرے پاس موجود ہے۔اور دس کاپیاں تین روز کے اندر اندر دیکھ کر بھیج دیں۔میرا معمول ہے کہ کاپیاں ہوں یا کاغذات ان کو میں چوتھے دن حتی المقدور بھیج دیتا ہوں۔سالہا سال سے اس میں فرق نہیں آیا۔کسی یونیورسٹی یا بورڈ کو شکایت نہ ہو کہ میں نے کوئی چیز

دیر کر کے بھیجی ہر کام ہفتوں پہلے کر کے سپرد کر دیتا ہوں۔ گورکھپور یونیورسٹی کا یہ سلوک غیر شریفانہ معلوم ہوا۔ لیکن میں اس پر احتجاج نہ کروں گا جو ہوا سو ہوا۔ آپ بھی کچھ نہ کہیے گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۳۹)

۱۰/اپریل ۱۹۶۴ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم تسلیم! جامعہ اردو سے آپ کا معاوضہ امتحان اب تک مل چکا ہوگا۔ کئی دن ہوئے دفتر نے اس کی اطلاع مجھے دی تھی۔

آپ کے یہاں سے Essay کی کاپیاں اور متعلقہ کاغذات موصول ہوئے۔ لیکن اس میں دو Tabulator کے نام نہیں دیے ہیں وہ بھیجوادیں۔ کاپیاں اور دوسرے کاغذات آج رجسٹرار کو بھیج دیے جائیں گے۔ مقررہ وقت سے آٹھ دن پہلے یہ ساری چیزیں بھیجی جا رہی ہیں۔ پارسال بھی یہی کیا تھا۔ لیکن آپ کی یونیورسٹی کی دفتری ابتری کو کیا کہیے۔ پچھلے خط کو تلف کر دیجیے گا۔ جس میں اس کا ذکر ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میرے جملہ نجی خط تلف کر دیے ہوں گے تاکہ ان کی اشاعت کا امکان بھی باقی نہ رہے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۴۰)

۱۱/اپریل ۱۹۶۴ء

محمود الٰہی صاحب مکرم تسلیم!

پچھلے خط میں اطلاع دے چکا ہوں کہ امتحان کی کاپیاں بھیج دی ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ پارسل جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ اس کو اب پرسوں بھیج سکوں گا۔

آپ کا ، رشید احمد صدیقی

(۴۱)

جمعہ ۱۵ر مئی ۱۹۶۴ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام شوق! ابھی ابھی آپ کا خط اور سانحہ کی خبر ملی جو چاہتا تھا کہ نہ ہو وہی ہو کر رہا۔ اگر اولاد کے مرنے کا غم ویسا ہی ہوتا ہے جیسا مجھ کو ہو چکا ہے اور روز بروز کم ہونے کے بجائے تازہ ہوتا جاتا ہے تو آپ پر کیا گزری ہوگی! کتنے بیم ورجا کے بعد وہی ہوا جس سے بچنے کی کتنی دعائیں مانگی گئیں کتنے جتن کیے گئے۔ معلوم نہیں اور کیا کیا نہ کیا گیا ہوگا! صبر کیجئے یا نہ کیجئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوں بہت سی باتوں کا خیال کر کے کر لیجئے تو اچھا ہے۔ ایسے صدمے میں ماں باپ جو چاہیں کر ڈالیں خدا کو باز پرس نہ کرنی چاہیے۔ البتہ ماں کو ہمہ وقت ہر طرح سے تسلی دیتے رہیے اس سے آپ دونوں کا غم ہلکا ہو جائے گا۔ ماں کو آپ سے کہیں زیادہ غم ہوگا۔ اس کو صرف آپ ہی کم کر سکتے ہیں۔ اپنے اس فرض کو ادا کیجئے آپ کے پچھلے خط کا جواب نہ دے سکا۔ اکثر یاد آتا تھا لیکن کچھ نہ کر پاتا تھا۔ جو عقائد آپ کے پیش نظر ہیں اس کو لکھ ہی ڈالئے۔ میرے مشورے بغیر وہ معتبر و مستند ہوگا۔ ایک طبیعت کا حال کچھ اس طرح کا ہے کہ ٹھکانے کا کوئی کام کرنے کی جیسے سکت نہ باقی رہی ہو۔ بہت دنوں سے یہی حال ہے لیکن کیا کروں کہ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ تعطیل میں مکان پر ہوں گے وہاں کا پتہ نہیں معلوم صرف ٹانڈہ لکھا اس لیے احتیاطاً یونیورسٹی کے پتہ پر یہ خط بھیجتا ہوں۔

آپ کا ، رشید احمد صدیقی

(۴۲)

۱۰ر نومبر ۱۹۶۴ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام مسنون!

کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی یونیورسٹی پھر اپنے پچھلے سال کے کارنامے کو اس سال بھی دہرائے۔ اس سال دس دن کے اندر کاپیاں دیکھ کر بھیج دی تھیں۔ لیکن انہوں نے دیر سے بھیجنے کا

الزام لگا کر معاوضہ کی رقم سے تاوان وصول کر لیا تھا۔ اس سال جلد سے جلد کاپی دیکھ کر بھیج دی۔ لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نیت بخیر نہیں ہے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۴۳)

۲۱ر نومبر ۱۹۶۴ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، تسلیم!

نامہ گرامی ملا تھا۔ ممتحنی کے بارے میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ بے ضرورت تھا مجھے اس کا مطلق خیال نہیں۔ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فکر ونظر کے حالیہ شمارہ میں سر سید سے متعلق آپ کا جو مضمون شائع ہوا ہے اسے یہاں سب نے بہت پسند کیا۔ اطمینان رکھئے۔

امید ہے آپ مسرور و مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۴۴)

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم تسلیم! ۲۴ر ماہ کو ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صاحب نے آپ کی تالیف ''صحیفۂ محبت'' کا ایک نسخہ آپ کی طرف سے مرحمت فرمایا۔ شکریہ۔ آپ نے مہدی افادی مرحوم کے ان خطوط کو یکجا کر کے جس محنت اور سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ اس سے دل خوش ہوا۔ مقدمہ بہت اچھا لکھا ہے۔ اس اعتبار سے خدا آپ کو خوش اور تندرست رکھے۔ تاکہ آپ اس طرح کے علمی وادبی خدمات حوصلہ اور اعتماد سے انجام دیتے رہیں۔۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۴۵)

۲۲/جنوری ۱۹۶۵ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکرمی تسلیم! آپ کے خط سے ابھی یہ خوش خبری ملی۔ آپ کو مستقل ریڈری تفویض ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے آمین۔ ترقی کے بعد جو ذمہ داریاں آپ پر عائد ہوتی ہیں۔ ان کا لحاظ رکھئے گا۔ اور جو اختیار میں ہوتے ہوں ان کو کم سے کم کام میں لائیے گا۔ اچھے لوگوں کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔ دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

(۴۶)

یکم جون ۱۹۶۵ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام مسنون!

عرصہ ہوا آپ کا عنایت نامہ اور اس کے کچھ دنوں بعد ''خط تقدیر'' (اردو کا پہلا ناول) موصول ہوا تھا۔ طرح طرح کے تردد اور مصروفیت کے ہجوم میں کتاب نظر سے اوجھل ہوگئی اور اس کا خیال بھی ذہن سے اتر گیا۔ دو تین دن ہوئے نظر آ گئی تو یہ چند سطریں لکھنے بیٹھ گیا۔ کتاب کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ اس عہد کی بیشتر تصانیف کا یہی انداز تھا۔ البتہ آپ نے کتاب کا مقدمہ جس شرح وبسط سے لکھا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ مصنف، کتاب، ان کے زمانے اور موجودہ عہد کے تصنیفی وتنقیدی تقاضوں کو بڑے سلیقے اور دقت نظر سے پیش کیا۔ کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ آپ اردو کے ان اہل قلم کی صف میں داخل ہو چکے ہیں جن کو ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کے اعتبار سے ممتاز درجہ حاصل ہے۔ تعجب اور خوشی اس کی ہے کہ آپ اس درجہ پر نسبتاً جلد فائز ہو گئے۔ آپ کی یونیورسٹی تعطیل کے سلسلہ میں بند ہوگی۔ گھر کا پتہ نہیں معلوم اس لیے آپ کے پبلشر کے توسط سے یہ خط بھیجتا ہوں۔ اس سے بہتر کوئی اور

صورت نظر نہ آئی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۴۷)

۲۵ر نومبر ۱۹۶۵ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکرمی سلام مسنون!

کچھ دن ہوئے آپ کے یہاں سے ہوتے ہوئے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب یہاں آئے۔ ان سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی تھی۔ یہ خط ایک عزیز کی درخواست پر لکھ رہا ہوں۔ آپ سے کچھ بن پڑے تو کر دیجئے۔ گورکھپور میں اور کوئی ذریعہ میری نظر میں نہیں ہے۔ وہاں چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ (ریلوے) کوئی فصیح الدین صاحب ہیں۔ معلوم نہیں علی گڑھ کے کبھی طالب علم رہے ہیں یا نہیں۔ ہوتے تو بغیر کسی تعارف کے موصوف کو براہِ راست تکلیف دیتا۔ صورت حال یہ ہے بنارس سے متصل مرواڈیہہ نامی ایک ریلوے اسٹیشن ہے جہاں صغیر احمد صدیقی ایک کم عمر نوجوان عرصہ سے گڈس کلرک (مال بابو) مال گودام کی ناصاف آب وہوا سے ٹی بی میں مبتلا ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کی ہے کہ مال گودام سے ہٹ کر کھلی ہوا میں کام کرنے کا موقع نکالیں۔ چنانچہ انہوں نے چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ گورکھپور (فصیح الدین صاحب) کو ڈاکٹری سٹیفکیٹ کے ساتھ درخواست بھیجی ہے کہ ان کو ٹکٹ کلکٹری کی لائن میں پھر منتقل کر دیا جائے۔ اگر کسی ذریعہ سے آپ کی رسائی فصیح الدین صاحب تک ہو سکے اور یہ کام بن جائے تو بڑی خوشی ہوگی۔

یہ بندوبست اتنا انتظامی Administrative نہیں ہے جتنا انسانی Humanitarian کام اگر نہ ہو سکے تو مطلع کیجئے گا۔ تاکہ کوئی اور راستہ دیکھا جائے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۴۸)

۱۵ر فروری ۱۹۶۶ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام مسنون! یاد آتا ہے کچھ دن ہوئے آپ سے ایک صاحب کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کی سفارش ریلوے کے کسی بڑے حاکم سے کر دیجئے۔ آپ نے جواب میں لکھا تھا کہ کام ہو جائے گا۔ مجھے یہ بات دفعتاً یاد آئی لیکن نہ ان صاحب کا نام یاد رہا جن کی سفارش چاہی تھی۔ نہ ان کا جن سے چاہی تھی۔ امیدوار غالباً مرواڈیہہ ریلوے اسٹیشن کے تھے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۴۹)

۲ر مارچ ۱۹۶۶ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام مسنون! آپ کے دونوں نوازش نامے ملے۔ ایک مفصل دوسرا کارڈ تکلیف فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے عزیز مشکور کو مطلع کر دیا ہے اور ہدایت کر دی ہے کہ آپ سے Contact کریں اور عرضی کی نقل بھی بھیج دیں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۵۰)

۲۰ر اگست ۱۹۶۶ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام مسنون!

۲۷ر کا نوازش نامہ ملا۔ امتحان کے سلسلہ میں حیدر آباد چلا گیا تھا۔ کل ہی واپس ہوا ہوں۔ سفر یقیناً مشکل تھا اور ناممکن لیکن کیا کیا جائے۔ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اس طرح کبھی اتمام حجت کرنا پڑتا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ فکر و نظر میں ادھر میرے مضمون کے تین اقساط شائع ہوئے اور آخری قسط اگلے مہینے میں طبع ہو سکے گا۔ فکر و نظر کا نظم و نسق اب ڈاکٹر نذیر احمد

صاحب کے ہاتھ میں نہیں رہا۔اس بارے میں کبھی خط و کتابت کرنا چاہیں تو حسب ذیل پتے پر کیجیے۔شاید پچھلے مطلوبہ شمارہ میں مل جائے۔سید شریف الحسن بلگرامی صاحب منتظم ''فکرونظر'' پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۵۱)

۲۱/جولائی ۱۹۶۶ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام مسنون! ایک دشواری کا سامنا ہے۔شاید آپ کی توجہ اور دوڑ دھوپ سے آسان ہو جائے۔میرے بڑے بھائی مرحوم کا لڑکا شکیل احمد صدیقی اس سال بی ایس سی کے امتحان میں شبلی کالج اعظم گڑھ سے شریک ہوا۔نتیجہ نکلنے پر معلوم ہوا کہ سپلیمنٹری میں آیا ہے۔ظاہر ہے وہ اس امتحان میں شریک ہوگا جس کا نتیجہ ستمبر میں شائع ہوگا۔اس دوران میں اس کے لیے سارے دروازے بند ہیں اور پورا ایک سال ضائع ہو جائے گا۔کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ کے کالج میں مشروط طریقہ پر ایم ایس سی میں وہ داخلہ پا سکے؟ صورت حال میں نے مختصر الفاظ میں بیان کر دی۔آپ کے کالج میں آپ کے علاوہ کوئی اور بھی جاننے پہچاننے والا ہو تو میری یہ دشواری اس کے سامنے پیش کیجیے۔کیا تعجب آپ دونوں کی جدوجہد سے مطلب براری ہو سکے۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔اس خط کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۵۲)

دوشنبہ ۱۵/اگست ۱۹۶۶ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم آداب!

نوازش نامہ پرسوں ملا۔آپ کا شکوہ بجا ہے کہ میں حیدرآباد کا طویل سفر کر سکا۔لیکن آپ کے متواتر اصرار کے باوجود گورکھپور نہ پہنچ سکا۔آپ کو اندازہ نہیں کہ کن مجبوریوں سے حیدرآباد کا

سفر اختیار کرنا پڑا اور نہ جاتا تو کیسی بھدی بات ہوتی۔ میں جانتا ہوں آپ کس احترام واخلاص کی بنا پر گورکھپور آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن کیا کروں کہ اس مہم کے لیے اپنے کو تیار نہیں کر پاتا۔ آپ معاف کر دیں اور مجھے ماڈریشن کے لیے نامزد نہ فرمائیں۔ اندیشہ ہی نہیں یقین ہے کہ میں فرمائش کی تعمیل نہ کر پاؤں گا اور آپ سے شرمندہ ہوں گا جو مجھے کسی حال میں گوارہ نہیں۔ آپ ایسے عزیزوں کی دل شکنی کون کرے گا۔ اس کے لیے معذرت، امید ہے آپ اور آپ کے اعزا اور رفقاء سب مسرور مع الخیر ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۵۳)

۱۳ر نومبر ۱۹۶۹ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محمود الٰہی صاحب مکرم، سلام!

نوازش نامہ موصول ہوا۔ ان دنوں آنکھوں میں بڑی تکلیف ہے۔ ڈاکٹروں نے لکھنا پڑھنا بند کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور معذوریاں بھی ہیں اس لیے آپ کی فرمائش کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے اور بفضلہٖ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۵۴)

۱۰ر مئی ۱۹۷۱ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سلام مسنون!

آپ نے جو فرمائش کی تھی وہ پوری کر دی گئی۔ امید ہے آپ مسرور و مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۵۵)

منگل ۶ / مارچ ۱۹۷۳ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مشفقی تسلیم!

۳ / کا نوازش نامہ ملا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ پروفیسر شپ پر فائز ہوئے۔ اللہ تعالیٰ پروفیسر شپ آپ کو آپ کے متعلقین اور احباب سب کو مبارک فرمائے۔ آمین۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے ملنے جلنے سے معذور رہتا ہوں اور دوستوں اور عزیزوں سے بڑی ندامت ہوتی ہے۔

خیر طلب ، رشید احمد صدیقی

(۵۶)

۱۸ / اپریل ۱۹۷۳ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مشفقی تسلیم!

نوازش نامہ ملا تھا کچھ ہی دنوں بعد آپ کی گرانقدر تصنیف ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی تجزیہ'' بھی موصول ہوئی اس کرم کا شکر گزار ہوں۔ کتاب میں آپ نے جن الفاظ میں میرا ذکر کیا ہے اس سے بہت متاثر ہوا اس لیے اور کہ آپ برابر مجھے اسی طرح یاد فرماتے آئے ہیں۔ اس سے میرا اتنا مستحق ہونا ثابت نہیں ہوتا جتنا یہ آپ کی شرافت محبت اور پاسِ وضع کی دلیل ہے۔

طرح طرح کی معذوریوں میں مبتلا ہونے کے سبب پڑھنا لکھنا تقریباً بند ہے۔ ممنوع بھی ہے پھر بھی کتاب کی جہاں تہاں سے ورق گردانی کرلیا۔ بڑی محنت اور قابلیت سے آپ نے اسے مرتب کیا ہے۔ مجھے امید ہے اس موضوع پر اسے استناد کا درجہ حاصل ہوگا۔ صفحہ ۴۶۴ پر آپ نے عزیز لکھنوی کے قصیدے کے چند اشعار (غزلیہ تشبیب کے) لکھے ہیں وہ اتنے قصیدے کے رتبے کے نہیں ہیں جتنے لکھنوی شاعری کے۔ اس نمونے کے جس کا انداز اور لب ولہجہ عام طور پر پسند نہیں کیا گیا آخری شعر کے جواز میں صرف اس صنفِ کلام کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ واسوخت

جہاں عاشق محبوب سے چونچلے کرتا ہے وہ مرد کے لیے کسی طرح زیبا نہیں۔ کہاں قصیدہ کی جزالت کہاں یہ ابتذال؟ دعا ہے کہ آپ مع الخیر اور خوش وخرم ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۵۷)

اتوار ۱۰ رفروری ۱۹۷۴ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی و مشفقی تسلیم!

۲ر کا نوازش نامہ ۸ر کو موصول ہوا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں بھٹکتا یا کسمپرس رہا۔ آپ نے جو خوشخبری دی وہ جتنی غیر متوقع تھی اس سے کہیں زیادہ اس نے آپ کی دیرینہ شرافت اور وضع داری کی یاد تازہ کر دی کیسے بتاؤں جس آشوب سے ہم سب گزر رہے ہیں اس میں آپ جیسے عزیزوں کا اظہار خلوص ومحبت کس درجہ متاثر ومسرور کرتا ہے اس خوش خبری کی سب سے پہلی اطلاع آپ کے مسرت نامے سے ملی۔ کسی نے بتایا کہ ریڈیو سے یہ خبر بہت بعد میں موصول ہوئی۔ اس حیص بیص میں تھا کہ کہیں اور سے تصدیق ہو جائے تو آپ کا شکریہ ادا کروں جس احترام وعقیدت سے آپ مجھے اکثر یاد کرتے رہتے ہیں اسی خوشی اور شکر گزاری سے مدتیں گزریں مجھے شعبہ میں آپ کی رفاقت یاد آتی ہے۔ خلوص اور پاس وضع کے لیے میرے Investment تھے آج تک ان کے Premium ہم دونوں کے حصے میں آرہے ہیں! کچھ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ادارہ کس طرح کن منازل سے گزرا یعنی کس کس کی کہاں کہاں سر محضر مہر لگی ہوئی تھی۔ گو مصلحت یہی ہے کہ یہ سرگرمیاں پردۂ خفا میں رہیں لیکن کیا کیجیے آفس کا یہ مطالبہ کتنا ہی نامناسب ہو قدرتی ضرور ہے۔

خدا حافظ

رشید احمد صدیقی

(۵۸)

جمعہ ۲۳ر فروری ۱۹۷۴ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
محمود الٰہی صاحب مکرم ومحترم، سلام مسنون!

۱۹ر کا نوازش نامہ ملا۔ آپ نے جو باتیں لکھی ہیں اس سے جی بڑا خوش ہوا۔ آپ نے میرے اور ڈاکٹر مسعود کے بارے میں جس غیر معمولی محبت وارادت کا اظہار کیا ہے اس کی نقل بجنسہٖ میں نے مسعود صاحب کو بھیج دی ہے اس کے جاننے کے وہ مجھ سے بدرجہا زیادہ مستحق تھے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۵۹)

بدھ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۵ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محبی وشفیقی، سلام مسنون! امید ہے کہ آپ خوش وخرم ہوں گے میرے ایک مکرم ضمیر الحسن صاحب وکیل جونپور میں ان کی دو صاحبزادیاں صبیحہ کنیز فاطمہ اور کنیز سعیدہ ہیں۔ آپ کے یہاں اردو پی ایچ ڈی میں داخلہ چاہتی ہیں۔ انہوں نے شبلی کالج اعظم گڑھ سے اردو میں ایم اے سیکنڈ کلاس میں کیا ہے چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کا داخلہ اپنے یہاں کرلیں اس کرم کا ممنون ہوں گا۔ میں نے ہدایت کردی ہے کہ لڑکیاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کریں۔ بہتر ہوگا اگر میرے حوالے سے آپ ایک خط میرے چھوٹے بھائی کو لکھ دیں۔ آپ کا مشورہ کیا ہے۔ پتہ یہ ہے۔

نیاز احمد صدیقی، محلّہ پیرزکریا، ڈاکخانہ مڑیاہوں، ضلع جونپور

بہت بہت شکریہ
مخلص
رشید احمد صدیقی

(۶۰)

منگل ۲۸رجنوری ۱۹۷۵ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ
مکرمی و مشفقی، تسلیم!

نوازش نامہ موصول ہوا۔ لڑکیوں کے داخلہ کے بارے میں آپ نے جن دشواریوں کا اظہار کیا ہے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ ایک سہارا پردۂ غیب کا بھی ہوتا ہے۔

''عزیزان علی گڑھ''! آپ کو پسند آیا۔ ضرور آیا ہوگا۔ اس لیے کہ آپ علی گڑھ کے نیازمندوں میں سے ہیں اور ناموروں میں بھی۔ اس نسبت سے خدا آپ کو مسرور مفتخر رکھے۔ یو پی اردو اکیڈمی سے آپ نے میرے علاج کے لیے کچھ امداد پانے یا لینے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پارسال بھی شاید آپ ہی نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اس پیشکش کا میں نے شکریہ ادا کیا تھا۔ لیکن معاف کیے جانے کی درخواست کی تھی آج بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں۔ بڑی احسان مندی کے ساتھ۔ آپ مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ میرے آپ کے بہت سے رفقاء کار اور خوش گزارا ایسے ہیں جو اکیڈمی کے اس کرم کے مستحق اور منتظر ہوں گے ان کی طرف چشم التفات رکھیئے مجھے اللہ اور علی گڑھ نے اس طرح کے عطیات و امداد سے اب تک مستغنی رکھا ہے۔ ان دونوں سے جب تک انحراف نہیں کرتا انشاء اللہ اسی پر اکتفا کروں گا جو ان کا دیا ہوا ہے۔ البتہ ایک مسئلہ ایسا ہے جس پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ پارسال اکیڈمی نے پانچ ہزار کا ایوارڈ میری دیرینہ مجموعی خدمات کے سلسلے میں منظور کیا تھا۔ پچھلے ہی سال میری کتاب ''ہمارے ذاکر صاحب'' جامعہ بک ڈپو دہلی نے انعامی کتب کے انتخاب کے لیے پیش کیا ہے۔ کتاب کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کو میری ''دیرینہ مجموعی خدمات'' میں شامل کر کے قابل اعتنا نہیں قرار دیا گیا، اور منظور شدہ پانچ ہزار کے ایوارڈ میں اسے بھی جگہ دی گئی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر یہ کتاب اسی سال شائع ہو کر پیش نہ کی جاتی تو میری دیرینہ مجموعی خدمات سے اس کو (کذا) سمجھ کر پانچ ہزار کا مستحق قرار دیا جاتا۔ مجھے نہیں معلوم میرے ساتھ جن دو حضرات کو یہ ایوارڈ دیا گیا ان کی بھی کوئی تازہ ترین تصنیف ایسی تھی جس کے

طفیل ان کو اس ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا یا کہا!

مختلف انعامات کے لیے مختلف Categories ہوتی ہیں جن کے تحت انعامات دیے جاتے ہیں یا نہیں دیے جاتے۔ پانچ ہزار کے ایوارڈ میں سے دوسری Categories کی جمع تفریق مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اسی سبب یا نقص کی بنا پر اس سال بھی (جب کہ وہ معیار کے اندر ہے) ''ہمارے ذاکر صاحب'' کو انتخاب سے حذف کیا گیا۔ شاید۔

بہر حال ایک بات تھی جو اکثر ذہن میں آتی رہی اس لیے عرض کر دی گئی۔ یہ کوئی احتجاج یا اپیل نہیں ہے۔ ایوارڈ کمیٹی کا فیصلہ اپنی جگہ پر مسلم اور قابل احترام۔ جس کو میں ملحوظ رکھتا ہوں اور رکھوں گا۔ ممکن ہے میرا نقطۂ نظر صحیح نہ ہو۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۶۱)

۴؍فروری ۱۹۷۵ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مشفقی! تسلیم

یکم فروری کا والا نامہ کل موصول ہوا۔ آپ نے صورت حال واضح کر دی۔ کل ہی میرے بھائی نیاز صدیقی کا بھی خط ملا۔ آپ کے کرم کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے کہ لڑکیوں کا داخلہ ہو سکے گا۔ میں بھی شکر گزار ہوں کہ آپ کی توجہ خاص سے ایسا ہو سکا۔

جی نہیں! میری ایسی کوئی کتاب نہیں جو مقررہ معیاد کے اندر شائع ہوئی ہو۔ ''ہمارے ذاکر صاحب'' سے متعلق آپ نے جو مجھ سے فرمایا ہے ٹھیک ہے۔ بس گفتگو ختم سمجھئے اور اس خط کو بھی تلف کر دیجئے جس میں یہ بحث آئی ہے۔ نجی خطوط کے بارے میں دوستوں اور عزیزوں سے بھی توقع کرتا ہوں اور وقتاً فوقتاً اس کی یاد دہانی بھی کراتا رہتا ہوں۔ امید ہے آپ اور متعلقین مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

■

ڈاکٹر عبدالحق کے نام

(۱)

۲۹ر مئی ۱۹۶۳ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
محترمی، تسلیم!

والا نامہ موصول ہوا۔ آپ ریاض خیر آبادی پر کیوں نہ ریسرچ کریں۔ مرحوم کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ عطرِ فتنہ کے بھی ایڈیٹر رہے ان کا دیوان غالباً سبحان اللہ صاحب مرحوم کے صاحب زادہ نے ریاض رضواں کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ ریاض کو گورکھپور سے بڑا انس بھی تھا۔ جس کا ذکر اپنے کلام میں کرتے ہیں۔ میں اب اس طرح کے کاموں سے دست کش ہو چکا ہوں۔ لیکن آپ کے اصرار سے یہ مشورہ دینا پڑا لیکن مجھے ہرگز اصرار نہیں ہے کہ آپ ریاض ہی پر تحقیقات کریں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲)

۷راپریل ۱۹۶۷ء
ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
محترمی سلام مسنون!

عنایت نامہ مورخہ ۴راپریل موصول ہوا۔ حکیم برہم صاحب کے مضامین ضرور ایڈٹ کیجیے، بعض احباب کا یہ کہنا کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں، صحیح نہیں بہت کچھ اہمیت اس کی ہوتی ہے کہ مضامین کس طرح ایڈٹ کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہتر ہوگا کہ اگر آپ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے خط وکتابت فرمائیں۔ اس عہد کے ادبی مشاہیر سے موصوف اچھی طرح

واقف ہیں اور بیش تر سے بہت قریبی تعلق رہا ہے کچھ اور نہیں تو اس سلسلے میں موصوف آپ کو بہت مفید مشورے دے سکیں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۳)

۲۶ر دسمبر ۱۹۶۷ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیز گرامی! سلام مسنون

۲۲ر دسمبر کا نوازش نامہ، جی ہاں پچھلے دنوں طبیعت خراب تھی۔ اپنے انٹرویو سے متعلق آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ کچھ غیر معمولی نہیں ہیں۔ کیا کیجئے گا۔ زیادہ تر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ لیکن مایوس ہونے کی بات نہیں ابھی آپ نو جوان ہیں اور اللہ نے آپ میں بڑی اچھی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ انشاء اللہ کامیابی کی صورت نکلے گی۔

دعا ہے کہ آپ خوش وخرم رہیں اور اپنے لیے زندگی میں اچھی سے اچھی توقعات کے پورا ہونے پر یقین رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح مدد کرتا ہے۔ بزرگوں کو آداب اور خوردوں کو دعائیں۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۴)

۲۹ر نومبر ۱۹۶۸ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی، آداب! ۲۶ر کا عنایت نامہ ابھی موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں۔ آپ نے جس خدمت کی فرمائش کی ہے وہ پوری نہ کرسکوں گا جس کے لیے عذر خواہ اور نادم ہوں۔ احباب کو سلام۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۵)

سہ شنبہ ۷/اپریل ۱۹۷۰ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عزیز گرامی، سلام مسنون! مرسلہ عطیہ ''اقبال کے ابتدائی افکار'' موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں۔ کتاب شروع سے آخر تک نہیں پڑھ سکا ہوں۔ اس کی نہ سکت نہ معالج کی اجازت۔ لیکن جہاں تہاں سے جتنا دیکھ سکا اس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ آپ کی استعداد اور محنت اور شوق کا بہت اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ تنقید میں یہی نہیں دیکھتے کہ تنقید نگار نے تنقید کے مطالبات کہاں تک اور کس طرح پورے کیے ہیں بلکہ اس کا بھی اندازہ لگاتے ہیں کہ اس کی تنقید اس کی شخصیت کا کس طرح انکشاف کرتی ہے۔ اس اصول پر آپ پورے اترتے ہیں۔ بس اتنی احتیاط ملحوظ رکھئے گا کہ کبھی اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ نہ رہئے گا کہ آپ نے سیکھنے اور سیکھتے رہنے کی منزل طے کرلی۔ اس طور پر آپ کے افکار ہمیشہ تازہ اور صحت مند رہیں گے۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

■

ڈاکٹر فیروز احمد کے نام

(۱)

۴؍مارچ ۱۹۷۶ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکرمی تسلیم! نوازش نامہ صادر ہوا۔ صحت کی خرابی کے سبب سے لکھنے پڑھنے کا شغل تقریباً ختم ہو چکا ہے اس لیے آپ کے استفسارات کا جواب لکھنے سے معذور ہوں۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے اور دریافت طلب کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کو لکھئے۔ مجھے امید ہے وہ آپ کی مدد فرمائیں گے۔ مناسب سمجھئے تو میرا حوالہ دے دیجئے گا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

(۲)

۱۷؍مارچ ۱۹۷۶ء

ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکرمی تسلیم! نوازش نامہ مورخہ ۱۲؍ ابھی ابھی موصول ہوا۔ جیسا اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں بہت سی معذوریوں کے سبب سے لکھنے پڑھنے کا شغل تقریباً ختم کر چکا اسی طرح ملنے ملانے کا بھی۔

آپ اپنے کام سے علی گڑھ ضرور تشریف لائیں لیکن اگر میں مل نہ سکا تو آپ میری طرف سے کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہوں۔ میرا ملنا جلنا دوستوں اور عزیزوں سے بھی بہت کم رہ گیا ہے۔ جس موضوع پر آپ تحقیقات کر رہے ہیں اس پر میری معلومات ناقص اور ناممکن ہیں اطلاعاً عرض ہے امید ہے مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔

مخلص ، رشید احمد صدیقی

■

ضمیمہ

تاثرات وتبصرے

Padmashree
Prof. Nazir Ahmad
Professor Emeritus

4/645, Sir Syed Nagar
Aligarh-202002
INDIA

باسمہ تعالیٰ

۹؍جولائی ۱۹۹۶ء

محبّ گرامی، سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مورّخہ ۲۲؍جون کچھ دیر سے ملا، آپ نے نظام اردو خطبہ کے لیے میرا نام تجویز کرایا ہے، یہ میری بڑی عزت افزائی ہے، اس کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں، ڈاکٹر صاحب! آپ کا اندازِ تخاطب اتنا دل آویز ہے کہ اس کے لیے آپ کو مبارک باد پیش نہ کرنا بڑا ظلم ہوگا۔

مخلص

نذیر احمد

۳۳ڈی۔۹/۲۶، ناظم آباد
کراچی-۷۴۶۰۸

محترمی و مکرمی، سلامِ مسنون

آپ کا گراں قدر تحفہ 'رشید احمد صدیقی افکار و اسالیب' موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے رشید صاحب کی زندگی اور فن کے متعدد گوشوں پر بہت عمدہ مضامین یک جا کر دیے ہیں۔

دو سال پہلے بھی آپ نے دو کتابیں عنایت فرمائی تھیں۔ ان کی رسید میں نے بھجوادی تھی، شاید میرا خط آپ کو نہیں ملا۔ آپ اپنے کاموں سے استفادے کا موقع دیتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کا ایسا کرم ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ
۶/دسمبر ۱۹۹۹ء

بخدمت گرامی
پروفیسر عبد الحق صاحب
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی
دہلی-۱۱۰۰۰۷

۳ڈی۔۲۶/۹، ناظم آباد
کراچی-۷۴۶۰۸

محترمی ومکرمی، سلامِ مسنون

آپ کا ۱۷/ جولائی کا گرامی نامہ تقریباً دو ماہ بعد مجھے ملا ہے۔ کراچی میں مسلسل بارشوں کی وجہ سے ڈاک کا نظام متاثر تو ہوا ہے، لیکن اتنی تاخیر کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے نہ صرف یاد فرمایا بلکہ بلانے کی سبیل بھی نکالی۔ ہندوستان کی سیر کو جی تو بہت چاہتا ہے مگر حالات ایسے ہیں کہ ایک ملک سے دوسرے ملک جانا خاصا مشکل کام ہے۔ حالات ٹھیک ہوں گے تو میں ضرور آؤں گا، مگر صرف دوستوں سے ملنے کے لیے۔ نظام اردو خطبات کے لیے آپ کا مجھے مدعو کرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے، لیکن میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ بڑی وجہ تو یہ ہے کہ میرا علمی قد وقامت ایسا نہیں ہے کہ میں اہلِ علم کے کسی اجتماع میں کچھ پڑھوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گوشہ نشینی کے سبب سے آج تک زندگی میں کبھی کسی جلسے میں شرکت نہیں کی۔ یہاں تک کہ کسی ادبی نشست میں حصہ لینے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں نے کبھی کوئی مشاعرہ بھی نہیں سنا۔ جس شخص کا یہ حال ہو وہ جامعہ دہلی میں کوئی خطبہ کیسے دے سکے گا۔ میں ۱۹۸۵ء میں ہندوستان گیا تھا تو دوستوں نے کئی تقریبات کا اہتمام کیا تھا۔ مگر میں نے معذرت کرلی تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے تو میری ایک کتاب کی تقریبِ رونمائی کا کارڈ بھی چھپوا لیے تھے۔ مگر میں ان کی خواہش پوری نہ کرسکا جس کا مجھے بے حد افسوس رہا۔

آپ کو کراچی تشریف لائے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔ یہاں میری طرح، بہت سے نیاز مند آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں، اور آپ کو یاد کرتے ہیں۔

آپ کو یہ جان کر افسوس ہوگا کہ اس مہینے کی ۷/ کو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کا انتقال ہوگیا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ
۶ ستمبر ۱۹۹۹ء

بخدمت گرامی
پروفیسر عبدالحق صاحب
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-۱۱۰۰۰۷

سید ابوالخیر کشفی
بی ۲۳۷، بلاک ۶
گلشنِ اقبال، کراچی-۷۵۳۰۰

۲۴/اپریل ۱۹۹۷ء

برادرِ عزیز! سلامِ مسنون

پچھلے دنوں کتاب نما میں آپ کے نام اردو کام کا احوال پڑھا۔ جی خوش ہوا۔ آپ کے لیے دعائے خیر کی، کہ یہی کر سکتے ہیں۔

اپنے بارے میں ذرا تفصیل سے لکھئے اور ہو سکے تو دوسروں کی خیر و خبر سے مطلع کیجیے۔

دعاؤں کے ساتھ
کشفی

جناب ڈاکٹر عبدالحق
شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی

گلفشاں
سول لائنز، دودھ پور
علی گڑھ

مورخہ ۱۶؍فروری ۱۹۹۷ء

مکرمی پروفیسر صاحب!

السلام علیکم۔ چند روز ہوئے غالب نامہ صادر ہوا۔ جس میں آپ کا مضمون مطالعۂ غالب بتوسط اقبال پڑھا۔ بہت دلچسپ اور بصیرت افروز مضمون ہے۔ بڑا لطف آیا۔ آپ نے دونوں شاعروں خاص طور سے غالب کو ایک نئے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

خیر اندیش

اسلوب احمد انصاری

۱۵؍جون ۲۰۱۰ء

محترم ڈاکٹر عبدالحق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پچھلے دنوں برار کے تاریخی شہر اچل پور جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ شہر خلجیوں کے دورِ حکومت میں برار کا پایۂ تخت تھا۔ وہاں ایک صاحب کے پاس ''پیش رفت'' دسمبر ۲۰۰۴ء کا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ میری دلچسپی دیکھتے ہوئے موصوف نے مذکورہ شمارہ میری بیگ میں رکھ دیا۔ کل رات آپ کا مضمون 'کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تیری قبا چاک'' پڑھتے وقت دل ودماغ کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اپنی کیفیت کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکنے کا اعتراف کرتا ہوں۔ آنجہانی پنڈت جگن ناتھ آزاد صاحب سے خط وکتابت تھی۔ انھوں نے چند کتابیں بھی ارسال کی تھیں۔ ان کی ایک مختصر سی کتاب ''گہوارۂ علم وہنر'' پر احقر کی تاثراتی تحریر شائع ہوئی تھی جسے انھوں نے پسند کیا تھا۔ ان کے چند خطوط پڑھ کر ان کی بشری کمزوریوں کا احساس ہوا لیکن میرے جیسا اردو ادب کا معمولی قاری کیا کہتا؟ آپ کا مضمون پڑھ کر بے اختیار زبان پر یہ مصرع آگیا:

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

آپ کی تحریر میں کئی جملے ایسے نظر آئے جو ایک مکمل مضمون کا حق ادا کرتے ہیں۔

فقط

محمد یعقوب الرحمٰن

یوت محل، مہاراشٹر

زیدی جعفر رضا
پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، ایف آر اے ایس
سابق صدر شعبۂ ہندی و ڈین فیکلٹی آف آرٹس

ایلیٹھا، ۲/۵۵، احمد نگر
دودھ پور، سول لائنس، علی گڑھ

باسمہ

مکرمی و مخدومی، تسلیمات و اخلاص

آپ کے مضامین خواہ تحقیقی ہوں یا تاثراتی، قاری کو اپنی گرفت میں لینا اور کچھ سوچنے کے لیے مجبور کر دینا خوب جانتے ہیں۔ 'ایوانِ اردو' کے تازہ شمارہ میں محترم ڈاکٹر محمد حسن صاحب مرحوم کی شخصی اور علمی انفرادیت کو جناب والا نے جس خوش اسلوبی اور فاضلانہ سحر کاری سے ابھارا ہے اسے دیکھتے ہوئے آپ ہی کا نقل کیا ایک مصرع ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دہرانے کو جی چاہتا ہے:

در حیرتم کہ پاکیٔ تحریرش از کجاست

شیراز ہند کی مٹی اپنے اثرات تو بہر حال دکھائے گی۔

احقر العباد

زیدی جعفر رضا

بشرف ملاحظہ

جناب پروفیسر عبدالحق صاحب مدظلہ
۲۳۱۵، گراؤنڈ فلور، ہڈسن لین
کنگزوے کیمپ، دہلی ۱۱۰۰۰۹

ابوالکلام قاسمی
پروفیسر
شعبۂ اردو

سابق ڈین، فیکلٹی آف آرٹس
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
فون (آفس): ۹۲۶-۲۷۰۰۹۲۰، ایکسٹینشن: ۱۶۳۲
ای میل: akqasmi@gmail.com

۷ ستمبر ۲۰۰۹ء

برادر گرامی قدر پروفیسر عبدالحق صاحب!

سلام مسنون

ٹیلی فون پر آپ سے گفتگو ہو چکی تھی۔ میں ممنون تھا کہ آپ نے اقبال والی کتاب بھیج کر مجھے استفادے کا موقع دیا۔ میں نے محض ازراہِ تذکرہ دیوانِ حاتم کا ذکر کر دیا تھا مگر آپ کے حسن ظن نے اسے حسن طلبی سمجھے بغیر مجھے دوبارہ شکریے کا موقع دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں سے آپ کی دو الگ الگ حیثیتیں اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں۔ اگر 'دیوان حاتم' کی تدوین وتحشیہ ومقدمہ میں آپ ایک بلند پایہ محقق نظر آتے ہیں تو اقبال، شاعر رنگین نوا' میں ایک ممتاز نقاد اور اقبالیات کے بہترین پارکھ۔ میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کریں۔

علامہ اقبال پر آپ کی کوئی تحریر ایسی نہیں پڑھی جو محض بھرتی کے لیے لکھی گئی ہو۔ ہر مضمون میں کوئی بات ہوتی ہے، الگ، مختلف اور خیال انگیز ـــــ آپ کا اسلوبِ بیان، چاشنی اور قدرے رنگینی کے باعث کبھی کبھی آپ کے مدعا کو التوا میں ضرور ڈالتا ہے مگر مجھ جیسے اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں کو کبھی الجھاؤ میں مبتلا نہیں کرتا۔ میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

انھیں کلمات کے ساتھ میرا یہ مشورہ بھی قبول کریں کہ آپ نے اب تک جو مضامین کتابی صورت میں نہیں شائع کرائے ہیں ان کے مجموعے بھی ضرور شائع کریں۔ آپ اپنی اہلیت اور صلاحیت کی مناسبت سے تنقید کی دنیا میں پوری طرح متعارف نہیں محض اپنی کم آمیزی کے سبب۔ خدا کرے آپ کے مزاج اچھے ہوں۔

ہمیشہ کی طرح آپ کا خیر اندیش

ابوالکلام قاسمی

پروفیسر عبدالمجید مضمر

صدر شعبۂ اردو

کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

۱۴؍ستمبر ۲۰۰۹ء

گرامی قدر جناب پروفیسر عبدالحق صاحب

تسلیم و نیاز 'اقبال —— شاعرِ رنگین نوا' کی صورت میں آپ کا گراں قدر تحفہ عنایت نہ ہوتا تو نہ جانے اور کتنے دنوں تک لبوں پر چپ کی مہر لگی رہتی۔ یہ بھی آپ کی نوازش کا ہی کرشمہ ہے کہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کتاب بھیجنے کا بالواسطہ انداز دیکھ کر ہی ایک محسن و مشفق کی ''ناراضگی'' کو سمجھ گیا۔ اندرونی سرورق پر آپ کی تحریر تیر کی مانند چبھ گئی۔ مسرت بھی ہوئی، شرمندگی بھی۔ آپ کی ناراضگی کا اندازہ پہلے سے تھا لیکن ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ اپنے عزیزوں کو بھلا دینا آپ کی شانِ کرم فرمائی کے خلاف ہے۔ سوچا تھا کہ قدرت کہیں ملا دے تو اس لمبی سی چپ کی معافی مانگ لوں۔ آپ کی وسیع القلبی کا علم ہے، معاف کیسے نہ کرتے۔

اتنی بڑی اردو دنیا میں ایسا تعلق خاطر بھلا اور کس سے ہے۔ لیکن ظاہر نہیں کر پاتا۔ محبوں کے تئیں اپنی تھوڑی سی غفلت بھی پہاڑ جیسے لگتی ہے، اس قدر کہ آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی ڈھٹائی معلوم ہوتا ہے۔ شرم سے خاموش ہوں، غافل نہیں ہوں۔ آپ کے لیے بھی تو میرے تئیں اس بات کا تجربہ نیا نہیں ہے۔ پھر اتنا ظلم کیوں!

الطاف میاں نے کل سویرے کتاب پہنچا دی —— نسیمِ سحر کی مانند۔ چھٹی تھی، دن بھر کتاب کو الٹتا پلٹتا رہا۔ دو تین مضامین فرصت سے پڑھ ڈالے لیکن نہ جانے کون سا احساس بیک وقت ساری کتاب کی سیاحت پر اکسا رہا تھا۔ سو باقی مضامین اِدھر سے اُدھر سے، پڑھتا رہا۔ آپ کے تبحرِ علمی، آپ کی ناقدانہ بصیرت اور تقریر و تحریر سے مرعوب ہوں اور یہ یارا بھی نہیں کہ کتاب کے بارے میں کچھ کہہ سکوں۔ یہ خوش آہنگ دلاویز زبان سیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ لیکن اس کے لیے تو عمرِ خضر چاہیے۔ اور اس کے بعد زہے قسمت!

دعاؤں کا طالب

مجید مضمر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

تین سہ ماہیوں پر مشتمل شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

افتتاحی مقالہ بعنوان ''شبلی کی انتقادی فکر کا ثقافتی منظرنامہ'' معروف اقبال شناس، محقق، نقاد اور استاد پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق نے دہلی سے بتوسط ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب، ارسال فرمایا۔ ادارہ اس کرم فرمائی پر دونوں اصحاب کا بے حد ممنون ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق نے مولانا شبلی نعمانی کی انتقادی فکر کو ثقافت کی بازآفرینی قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

> ''شبلی کے نزدیک فن کی تشریح اور تخلیق کو تحریک دینے اور تہذیبی اقدار کی بازآفرینی تنقید ہے جو فن کے مطالعے یا اس تک رسائی کے لیے تشویق و ترغیب دینے کی موجب ہے۔ گویا نقد ستانی ثقافتی ارکان و اقدار کی بازیابی کی کوشش ہے، جو نہاں خانۂ تخلیق میں حرفِ راز بن کر شامل ہوتی ہے۔''

عہدِ حاضر میں تنقید اور ثقافت پر مبنی مباحث اٹھانے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی ہے کہ تنقید کئی غیر فطری رویوں کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہے۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق:

> ''جدلیت، جدیدیت اور ماقبل و مابعد کے مجہول تصورات نے عام گمراہی پھیلائی ہے۔''

ان حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ تنقید کو اس کا ثقافتی تناظر لوٹا دیا جائے۔

علامہ شبلی نعمانی کے علاوہ اقبال کی فکر بھی ایک نہایت توانا ثقافتی تناظر رکھتی ہے بلکہ کلامِ اقبال کی تشریح و تعبیر، تفہیم و تسہیل اسلامی ثقافت کا حوالہ دیے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی رائے کم و بیش جملہ مشرقی ادبیات و انتقاد کے حوالے سے دی جا سکتی ہے۔ توانا ثقافت، ہر عہد میں اقوام کی شناخت اور بقا کی ضامن ٹھہرتی ہے۔ اس سرچشمۂ توانائی سے صرفِ نظر ادبیات اور انتقاد کو مجہولیت کا شکار بنا سکتا ہے۔

محمد نعیم بزمی (مدیر)

دنیائے نقد و شعر میں جب بھی عاشقانِ اقبال کو یاد کیا جائے گا تو ان میں پروفیسر عبدالحق کا نام صفِ اول میں ہوگا۔ پروفیسر عبدالحق کی اقبال شناسی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ 'اقبال کے شعری اسالیب' اور 'اقبال کی شعری و فکری جہات' کی ترتیب کے علاوہ ۱۹۶۹ء سے ۲۰۰۹ء تک موصوف اقبال پر اپنے مضامین کے پانچ مجموعے شائع کر کے علامہ سے فکری مناسبت کا اعلان کر چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'اقبال اور اقبالیات' کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۶ء میں اس کا نقشِ اول شائع ہونے کے بعد ۲۰۰۹ء میں نقشِ ثانی بھی سامنے آ گیا ہے۔ مبصر کے پاس کتاب کا جو نسخہ ہے وہ ۲۰۰۶ء کا مطبوعہ ہے لیکن گمان ہے کہ نقش ثانی میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں ہے کیونکہ ۲۰۰۹ء ہی میں 'اقبال ـــــ شاعر رنگین نوا' کے عنوان سے آپ کا ایک اور مجموعۂ اقبالیات شائع ہو چکا ہے۔ مبصر کے محدود مطالعہ کی رو سے اقبال پر لکھنے والے دوسرے مصنّفین نے فکرِ اقبال اور ان کے شعری اسلوب پر اظہارِ خیال کیا ہے جب کہ پروفیسر عبدالحق نے خود اقبال کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے جس میں اقبال کا فکر و فن از خود شامل ہو گئے ہیں۔ بحرِ اقبال میں غواصی اور میدانِ ادب کی مہم جوئی میں ممتاز ہونے کے باوجود پروفیسر صاحب کی انکساری ہے کہ انھوں نے خود کو ہمیشہ واحد متکلم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مصنف کے تیرہ مقالات ہیں جن کے عنوانات کا تنوع قاری کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۱) اقبال اور مقامِ شبیریؑ، (۲) اقبال کے عمومی اثرات، (۳) اقبال کا شعری آہنگ، (۴) سرسید: مصدرِ اقبال، (۵) اقبال کی غالب شناسی، (۶) اقبال کی بیدل شناسی، (۸) اقبال اور تصوف، (۸) اقبال کی تحریروں میں تحریف، (۹) اقبال اور نقدِ فراق کی نارسائی، (۱۰) کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تیری قبا چاک، (۱۱) گذشتہ دہائی میں اقبالیات (۱۲) علی گڑھ میں اقبالیات، (۱۳) ابلیس کی شورائی مجلسیں۔

پروفیسر عبدالحق صاحب انتہائی پختہ فکری کے حامل ہیں اور ہر معاملہ میں بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ موصوف اپنے عنوان کا معروضی ذہن کے ساتھ موضوعی مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے ان کے مرکزِ گفتگو کی داخلی و خارجی دونوں صورتیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور تحریر سے ثنویت کا عنصر خارج اور وحدتِ فکر کا تلازم قائم ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب کی تحریر عالمانہ اندازِ بیان کا نمونہ ہے۔ موصوف اردو زبان کے بعض معاصر نقادوں کی طرح غلط اصطلاحات وضع کرنے، ان پر اصرار کرنے اور انھیں مروج کرنے کے شغل سے کوسوں دور ہیں۔ پروفیسر صاحب کی تنقیدی نگارشات کو یونیورسٹیوں کے اردو کے نصاب میں جگہ ملنی چاہیے کیونکہ یہ زبان و بیان کا علمی نمونہ ہیں۔

تجزیہ و تبصرہ
ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی
(تبصرہ نما طویل مضمون کا اقتباس)

اقبال شناسوں کے درمیان پروفیسر عبدالحق، سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ اس وقت تک سات کتابوں کے مصنف، بارہ کتابوں کے مرتب اور چھ کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے تصنیفی دنیا میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ خاکسار آپ کی تحریروں سے کافی فیض اٹھا چکا ہے اور دو کتابوں پر تجزیہ وتبصرہ بھی کر چکا ہے۔ 'اقبال-شاعرِ رنگین نوا' کے کلک گہربار کا اب تک آخری شاہکار ہے۔ اس مجموعہ مضامین میں حرفِ آغاز اور ضمیمہ کے علاوہ مختلف عنوانات پر مصنف کے چودہ مقالات ہیں، جن کی ترتیب حسب ذیل ہے:

(۱) اقبال اور ایشیائی بیداری، (۲) آیۂ نور اور اقبال، (۳) فکرِ اقبال کی سرگذشت کا تیسرا دور، (۴) اقبال اور رومی-عجزِ بیان کا اعجاز، (۵) بیسویں صدی کے فکری تضادات اور اقبال، (۶) حالی پیشرِو اقبال، (۷) عبدالسلام ندوی: آزاد بھارت کے پہلے اقبال شناس، (۸) اقبال اور قدیم ہندی فکر و فلسفہ، (۹) اقبال کا جہانِ شاہین، (۱۰) اقبال کا تصورِ جنگ و جہاد، (۱۱) اقبال وغالب کے چند انگریزی تراجم، (۱۲) 'بکھرے خیالات' کا تجزیاتی مطالعہ، (۱۳) اقبالیاتی تحقیق میں ڈاکٹر گیان چند جین کی نارسائیاں، (۱۴) اقبال اور الہ آباد۔

اس مجموعۂ مضامین کا پہلا مقالہ 'اقبال اور ایشیائی بیداری' ہے۔ ناچیز مبصر نے پروفیسر عبدالحق صاحب کی بہت سی تحریریں پڑھی ہیں لیکن اس مقالہ کے تاثر میں وہ یہ کہنے میں تکلف محسوس نہیں کرتا کہ اقبال کو پیش کرنے میں پروفیسر صاحب نے جس ژرف نگاہی کی ثبوت دیا ہے وہ دوسرے مقالوں سے یقیناً ممتاز ہے۔ دراصل اقبال کو سمجھنے میں جس تاریخی، جغرافیائی، مذہبی اور منطقی شعور کی ضرورت ہے، انھوں نے اس کا وافر ثبوت مہیا کیا ہے۔

کتاب کی پیش کش نہایت اعلیٰ ہے جو علمی حلقوں میں پذیرائی کی مستحق ہے۔ یونیورسٹیوں میں اس کتاب کو مطالعاتِ اقبال کے گوشہ میں جگہ ملنی چاہیے، خصوصیت سے اس لیے کہ پروفیسر عبدالحق صاحب کا طرزِ تحریر اردو نثر میں 'زہرۃ الادب' (Euphuism) کا واحد نمونہ ہے جس سے طلبہ کو واقف ہونا چاہیے۔ یہ ذخیرۂ اقبالیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

تجزیہ وتبصرہ

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

(تبصرہ نما طویل مضمون کا اقتباس)

پروفیسر علی احمد فاطمی

صدر شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

''اقبال-شاعرِ رنگین نوا'': ایک جائزہ

ہندوستان میں اردو کی تحقیقی وتنقیدی دنیا میں پروفیسر عبدالحق کا شمار یوں تو ایک پروفیسر دانشور اور محقق کے ہوتا ہے اور انھوں نے شیخ حاتم پر عمدہ کام بھی کیا ہے۔ ایک اردو لغت بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ متعدد کتابیں ترتیب بھی دیں ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی اصل اور بنیادی شناخت ماہرِ اقبالیات کی ہے۔ ان دنوں برصغیر میں جو معدودے چند اقبال شناس شمار کیے جاتے ہیں۔ ان میں ممتاز اور نمایاں مقام پروفیسر عبدالحق کا ہے۔ ان کی کتابیں اقبال کے ابتدائی افکار (۱۹۶۹ء)، تنقید اقبال (۱۹۷۶ء)، فکر اقبال کی سرگذشت (۱۹۸۹ء) کے علاوہ اقبال کے حوالے سے نہ جانے کتنے خطبات ومقدمات کی گونج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔

'اقبال-شاعرِ رنگین نوا' ان کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں ان کے پندرہ مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے عنوان اور اس کے بعد حرفِ آغاز کی ابتدائی چند سطریں ملاحظہ کیجیے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مضامین کی نوعیت اور غرض وغایت کیا ہوگی۔ لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی شاعری حیرت ومسرت سے معمور اک مردِ قلندر کا کشکول ہے، جو تخلیقی معجزات کا حیرت کدہ ہے تو دوسری طرف تمام تر مطالعے کے باوجود تشنگی کا احساس دیدۂ حیراں کے لیے ایک تماشا ہے۔ پامالی کا یہ خیال مطالعہ کو مہمیز کرتا رہتا ہے۔ ان کے چشمۂ حیواں سے دامنِ علم کو سیراب کرنے کی طلب بڑھتی جاتی ہے۔ اقبال کے جوش وجنون کی یہی سرشاری ہے جو سر سے جانے کا نام نہیں لیتی۔ ان کے بحرِ پُر آشوب کا سودا زندگی کا شریک و رفیق بن جاتا ہے۔ یہ جاں طلب ہے اور جاں بخش بھی۔ لذتِ یکتائی دیکھیے کہ اقبال کو اپنے علاوہ کسی غیر کی موجودگی گوارا نہیں۔''

ان تحریروں کے آہنگ کو ملاحظہ کیجیے ایسا اقبالی آہنگ اسی وقت ممکن ہے جب قاری یا ناقد

کا مطالعہ جذبِ دروں میں سرایت ہو کر سراپا اقبال فہمی کا پیکر بن جائے۔اسی پیکریت کا نتیجہ ہے کہ عبدالحق کے مضامین کی شہرت ہوئی اور تعریف بھی۔مقالے مذاکروں کے لیے لکھے گئے یا کسی اور مقصد کے لیے یہ اہم نہیں، اہم یہ ہے کہ مقالے کیسے ہیں اور کیا ہیں؟ کیا وہ کسی نئے اقبال اور آج کے اقبال کا سراغ دیتے ہیں۔

'بیسویں صدی کے فکری تضادات اور اقبال' مضمون کی ابتدا عالمانہ اور دانشورانہ انداز میں ہوتی ہے۔ان تحریروں میں محقق عبدالحق کم دانشور اور اسکالر عبدالحق بولتے نظر آتے ہیں:

''در حقیقت فکر و نظر کی کشاکشوں کو مغرب کی ثقافتی ثروت کے بے جا غرور نے جنم دیا۔''

''طاقت کے توسط سے حکمرانی ہی نہیں تہذیب و تمدن کو بھی برتری حاصل ہوتی ہے۔''

ان جملوں میں اقبال فہمی کی ایک امتیازی شان تو نظر آتی ہی ہے نیز مصنف کی جہتِ فکر اور عمقِ علم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مضمون کی ابتدا میں مشرق و مغرب اور ماضی و حال کے تصورات و رجحانات کو بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ایک اور بات مصنف نے کہی کہ حالی نظم اور غزل دونوں اصناف کے شاعر ہیں تو اقبال بھی ان دونوں اصناف پر غیر معمولی طبع آزمائی کرتے ہیں۔مثنویوں کا انداز بھی ایک سا ہے۔پھر ان نظموں و مصرعوں کا تذکرہ جس میں اقبال، حالی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور آخر میں مصنف نے یوں خراج پیش کیا ہے:

''حالی صرف اقبال کے ہی نہیں بلکہ ہماری سخن وری اور سخن شناسی کے پیش رو ہیں۔اقبال نے حالی کے تصورات کو تنوع و توسیع دے کر ہمارے شعر و فکر کو گراں بار کیا ہے۔''

مصنف نے دونوں بڑے شعرا کی مماثلتوں کو عرق ریزی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے بڑے سلیقے سے ادب کے افکار و اقدار کو وسعت دی ہے اور تاریخ و تہذیب، مسائل و مصائب کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مصنف کا اصل موضوع اقبال ضرور ہے لیکن شعرِ اقبال اور فکرِ اقبال کی جو شعاعیں ماضی اور مستقبل میں پھوٹتی ہیں ان تک عالمانہ و ناقدانہ رسائی ہر ایک کے بس کی بات

نہیں لیکن عبدالحق کی دانشوری اور آگہی حالی، سرسید، شبلی وغیرہ کے ذریعہ ماضی تک پہنچتی ہے تو فیض، قرۃ العین حیدر کے توسط سے مستقبل تک ـــــ درمیان میں اقبال ہیں اور رشید احمد صدیقی کا یہ قول بھی کہ "غالب اور اقبال کے مطالعہ کے بغیر کوئی بڑا شاعر وجود میں نہیں آسکتا۔"

مضامین اور بھی ہیں اقبال کا تصورِ جنگ و جہاد، اقبال اور غالب کے چند انگریزی تراجم، بکھرے خیالات کا تجزیاتی مطالعہ کے علاوہ گیان چند اور عبدالسلام ندوی پر ہیں جو اپنے اپنے انداز سے ایک خاص فکری زاویے اور عبدالحق کی جرأت و جسارت کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ اقبال کے ساتھ کسی بھی غیر علمی اور غیر منطقی بات کو درگزر کرنے کو تیار نہیں۔

مندرجہ بالا مضامین کے ذریعہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالحق واقعتہً ایک سنجیدہ اور عمدہ اقبال شناس ہیں اور ان کی اقبال شناسی محض ان کی عقیدت مندی یا ارادت مندی تک محدود نہیں بلکہ علم و شعور، تاریخ و تہذیب، فکر و فلسفہ کے متعدد ابعاد اور زاویے اس کتاب کے سنجیدہ و معیاری مضامین میں بھرے پڑے ہیں اس پر ان کا مدلل اور منطقی انداز و اسلوب متاثر کرتا ہے، چونکاتا ہے اور کہیں غور و فکر اور کہیں کہیں بحث و تمحیص کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ یہ مضامین کی کامیابی ہوا کرتی ہے کہ ان کی خیال انگیزی قارئین کے درِ شعور پر دستک دینے لگے۔ عبدالحق کا مثبت اور معروضی اندازِ فکر شعر و ادب میں اس کے انعکاس اور انجذاب کے پرتوں اور جہتوں کو وہ جس محققانہ و ناقدانہ انداز میں تلاش کرتے ہیں اور مدلل و منطقی انداز میں پیش کرتے ہیں، وہ صرف ان کو اقبال تک محدود مشروط نہیں رکھتیں۔ اسلامی افکار، مسلمانوں کے حالات، برصغیر وکبیر دونوں کے مقدمات، مشرق و مغرب کے تصادمات، تہذیبی تضادات اور سب سے بڑھ کر بنی نوع انسان کی ترقی و بہبودی، احترام آدمیت سے اگر مصنف یا ناقد خود کو وابستہ نہیں کرتا تو وہ اقبال کی شاعری کا معقول و معتدل عرفان حاصل نہیں کرتا۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اقبال کی گرمیٔ فکر و سخن کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے نیز عبدالحق کی گرمیٔ فکر اور منطقی لسان کا لطف اور حظ ملتا ہے وہ تحقیق و تنقید کو تخلیق کی حدوں تک لے جاتا ہے۔ یہ فیضانِ مطالعۂ اقبال ہے جس نے عبدالحق کے محققانہ ذہن کو ایک بڑے ناقدانہ وژن میں بدل دیا ہے۔ بڑی شاعری، بڑی دانشورانہ شخصیت کا فطری اور شعوری اثر دبے پاؤں قاری اور سامع کے قلب و جگر میں سرایت کر جاتا ہے۔ عبدالحق گذشتہ کئی

دہائیوں سے مطالعۂ اقبال میں غرق ہیں اس لیے ایسے بلیغ و باکمال جملے فطری وفکری انداز سے ڈھلتے چلے جاتے ہیں جس سے ان کی وسیع النظری اور ادراک و آگہی کا غیر معمولی اظہار ہوتا ہے پھر ایک منزل آتی ہے کہ حامد اور ممدوح ایک نقطۂ ارتکاز پر پہنچ کر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

ایک عمدہ کتاب کا رول یہی ہوتا ہے کہ وہ موضوعِ کتاب کو پارہ پارہ کردے، نارسائی کو رسائی میں بدل دے اور مصنف کے منطق واستدلال کو پانی پانی کردے۔ اقبالیات پر کتابیں بے شمار ہیں لیکن ایک ایسی کتاب جو ذہن میں بالیدگی اور خیال میں پاکیزگی کے عناصر کو بیدار کردے اور ایک مخصوص علمی انبساط سے دوچار کردے ذرا کم ہوتا ہے لیکن عبدالحق کی کتاب ''اقبال —— شاعرِ رنگین نوا'' ایک ایسی ہی کتاب ہے جو ان تمام کیفیات سے دوچار کرتی ہے۔ آج کے عہد سے وابستہ ہوتی ہے اور اقبالیات کو ماضی اور مستقبل کی طرف لے جاتی ہے۔ اقبال فہمی کے لیے مدعو کرتی ہے۔ انسان اور انسانیت کے مسائل کا عرفان عطا کرتی ہے۔ ایسی عمدہ، فکر انگیز کوشش و کاوش اور تحقیق وتنقید کے لیے مصنف کو جس قدر مبارک باد دی جائے، کم ہے۔

(مضمون کے اقتباسات)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نذرانۂ عقیدت عالی جناب محترم المقام ڈاکٹر عبدالحق صاحب

ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مورخہ ۳ر جون ۱۹۸۹ء

نگاہِ لطف و کرم ہے شفائے سوزِ جگر
بلند تیرے عزائم شگفتہ شوخ نظر

چمن میں غنچہ و گل ہیں رہینِ لطف و کرم
ادب نواز تلون مزاج ذوقِ نظر

حریف تیرا نہیں وسعتِ نظر ہے گواہ
جہاں میں علم و ادب کا ہے خوشنما گوہر

خدا کا شکر ہے معمورۂ صفاتِ امم
شعاعِ نورِ سحر مہر و ماہ کا پیکر

ترا ضمیر ہے آئنہ سازِ حسنِ کلام
ستیزہ کار ہے کسبِ کمالِ علم و ہنر

یہ مانا صوفی و ملا سے ربط ہے تجھ کو
نہیں ہے ان کے مجالس میں آبروئے ہنر

خوشا نصیب کہ بخشا ہے تجھ کو زورِ قلم
خرد ہے عقدہ کشا معرکۂ فکر و نظر

تمہاری کاوشیں مرہونِ مرجعِ اقبال
حدیثِ شرحِ محبت متاعِ قلب و نظر

تمہاری ذات سے نامِ وطن بلند ہوا
کلی نے آنکھ جو کھولی تو بخشا نورِ بصر

سفر طویل بجھا ہے چراغِ دیر و حرم
اندھیری رات میں قبلہ نما رخِ انور

جواں ہیں تیرے عزائم صدائے ضربِ کلیم
خودی ہے معرکۂ ذکر و مخزنِ گوہر

یہ تیری قوتِ تسخیر گردشِ پیہم
نہیں ہے میری نظر میں کوئی ترا ہمسر

خلوص و عجز کا پیکر فروغِ شعر و ادب
عیاں ہے کاشفِ دلگیر پہ ترا جوہر

حسنِ کرم نواز سے تکمیل آرزو
فیضانِ علم ہے تری تحقیق و جستجو

اربابِ حل و عقد نے بخشا ہے رنگ و بو
حق کہ ہے سرشت میں تیرے تعاونوا

نوٹ: تعاونوا علی البر و التقوی۔' (سورۂ مائدہ، پارہ ۶) (جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو)

حافظ سراج الدین کاشف
(امام جامع مسجد)
مچھلی شہر، ضلع جون پور، یوپی

[illegible]

نوبت بہ تنگی صورت حال یہ ہے کہ جیسی حال میں ہوں

وہ رہنے ہی نہ دیتا کہ تکلیف دہ ہے اور روز بروز ادا

پڑھتا جا رہا ہے ہر کسی اور کی کتابت مجھ کر دوں!

ایسی ہے جس کا سامنا ہے کہ کچھ بھی تو نہ رہ جائے

یہ غیر کی محتاجی بڑھتی ہے کہ در پیش وہ عکس دل نہ ہو

پر قصہ یہ حالات ہے — اور خوب تم پڑھ کی دعا و دوا [illegible]

دہ ہے یہ جیسے برابر ساتھ گزر رہا ہے - اب سے گر کوئی [illegible]

[illegible]

पोस्ट कार्ड
POST CARD
पता ADDRESS ONLY
JUN 6[illegible]

POSTAGE
INDIA
5 nP

بخدمت [illegible] احمد صدیقی

[illegible] Purzakaria

[illegible] P.O. Marzahu

ضلع جونپور District Jaunpur

[illegible] مکمل [illegible] کراؤ والسلام علیکم

[illegible] تقریب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مکمل [illegible]

[illegible] ۵ [illegible] خدا کرے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ٹکٹ آ گئی [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible] ترقی ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

[illegible] شاید [illegible] جنگ

[illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible]

[illegible] بہتر [illegible] اور بہتر سے بہتر [illegible]

[illegible]

POSTAGE INDIA 5 nP

पोस्ट कार्ड
POST CARD
केवल पता
ADDRESS ONLY

بذریعہ ... [illegible]

[illegible]

D.O. Bariahu
(District Jaunpur)

ورنہ یہ ... [illegible] ... جیسے گذر رہے ہیں

... [illegible] ... ہو گیا ہے

... [illegible] ... کیوں اور کیا کروں اور کس طرح

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

بسوکلوا، یکم نومبر [illegible] - ڈاکخانہ - ضلع [illegible]

مشفقی - تسلیم - ۲۹ کا نوازش نامہ ملا اور

جو جیبیرے اور چیمبر منیجر کے تحفے کتاب آزادی کی

جمع کیا اگر صاحب پڑھنا لگے - ان سے ملاقات کر لیں

ورنہ اطلاع شکریہ [illegible]

آپ پڑھا دیکھیں - سب لوگ آئے حسن [illegible]

اور ڈبرہ ہی رہے ہیں لیے کہ ہم کے سب ان کے لیے

حال ہے سیاسی گزارش ہے کہ آپ کچھ توجہ دیں

مسلمانوں کا وہاں لگا ہے اور جو پڑھنے کے لیے

تو مجھے جیسے پیر میرٹ کی تاکید کی ہے کہ پہلے سے متعلق کچھ

چلو دے ہیں، پہنچے جنازہ پاکی میرے گا وہاں خرابی

آئے گی - محمد حسن صاحب کو میرا بہت بہت سلام

شکریہ پہنچائے - اپنی باغ کا چراغ میرے باغ کو

روشن کرے ایسا ہی ہے جیسے فارسی کے مشہور شاعر

غنی کاشمیری نے کہا ہے: غنی پیر کنعاں کے



Syed Ale-Hasan
Zaidi Sahab
Central Office
New Forest
Dehradun
دہرہ دون

روز سیاہ کو تو دیکھا، انکا نورِ عین زلیخا کی
آنکھ کو روشن کرتا ہے!!

آپ سب کو بہت بہت دعا۔ میرا سلام
مستحق اب آپکے دور دور تک نہ ملنے والے سلام کی
لکھ سکتا۔ خدا حافظ۔ ایک بار پھر نوازش کا شکریہ
مخلص رشید احمد صدیقی

Dr. Abdul [illegible]
M.A. [illegible]
Department of [illegible]
Delhi University
Delhi

[illegible]

شعبۂ ... مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عزیز گرامی سلام مسنون

رسید علیہ آپ کے ابتدائی ...

شکر گزار ہوں۔ کتاب شروع ...

نہیں پڑھ سکا ہوں۔ ...

معاف کیجیے کہ اجازت ۔ ...

[illegible]

पोस्ट कार्ड
POST CARD

केवल पता
ADDRESS ONLY

Abdul Haq Siss...

Pakharpur

P.O. Machhli Sha...

(Jaunpu...

Personal